U49665 16-12-99.

Title - FAANI

Creator - Abdul Shakoor.

Publisher - Kitabi Duniya (Delhi).

Date - 1947.

Pages - 194

Subjects - Faani Badauni - Sawaneh-o-Tanqeed
Tazkira Shora - Faani Badauni.

فانی
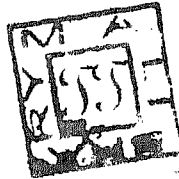
مرتبہ

پروفیسر عبدالشکور

پرنسپل حلیم مسلم کالج کانپور

کتابی دنیا لمیٹڈ - دہلی

بار اول ۔ ۱۰۰۰ جون ۱۹۴۷ء

قیمت دو روپے

(فاروقی پریس لال کنواں دہلی)

"حسرت موہانی" کے لکھنے کے بعد اصغر پر مضامین کا مجموعہ مرتّب کر کے شائع کرایا گیا۔ اب فانی پر یہ مضامین اس لئے جمع کئے گئے ہیں کہ یہ سلسلہ مکمل ہو جائے۔ اس بزم میں چند محترم احباب نے شرکت فرمائی ہے جو اچھے سخن سنج اور نقاد تسلیم کئے جاتے ہیں اور جنھوں نے فانی کے کلام کا مطالعہ بڑے غور و فکر کے ساتھ کیا ہے۔ جناب حکیم مختار احمد مختار بدایونی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مرحوم کے چند خطوط مرحمت فرمائے جو اس مجموعہ میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ سرور صاحب اور سبطین صاحب نے اپنے پرانے مضامین کا چولا بدل کر اس مجموعہ کے لئے مرحمت فرمائے اور فراق صاحب کا مقالہ ان کی اجازت سے بجنسہ درج کیا جاتا ہے۔ میں ان حضرات کی خدمت میں شکریہ پیش کرتا ہوں۔

ع۔ ش

سوانح حیات کا خاکہ[1]

پروفیسر عبدالشکور

نام ۔ شوکت علی خاں

تخلص ۔ پہلے "شوکت" تھا۔ بعد کو "فانی" اختیار کیا۔

والد کا نام ۔ شجاعت علی خاں۔ جو بدایوں کے ایک بلند پایہ رئیس اور زمیندار تھے۔

پیدائش ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء بمقام اسلام نگر، ضلع بدایوں، جہاں ان کے والد سب انسپکٹر تھے۔

بسم اللہ ۔ ۱۸۸۳ء میں ہوئی۔

اپنے پہلے استاد (مولوی صاحب جو خود بھی شاعر تھے) کے سایۂ عاطفت میں شعر کہنے کا ذوق پیدا ہوا۔ گیارہ سال کی عمر سے فانی نے باقاعدہ مشق سخن شروع کر دی تھی۔

([1] ان صفحات کی تیاری میں بیگم صاحبہ عشرت رحمانی نے مدد فرمائی۔ میں انکا ممنون ہوں، موصوفہ فانی مرحوم کی بھانجی ہیں)

اسکول۔ ۱۸۹۴ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۷ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔

کالج۔ بریلی کالج میں چار سال تعلیم حاصل کی اور ۱۹۰۱ء میں اس کالج سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔

ابتدائی ملازمت۔ فانی کو ملازمت کی مطلق ضرورت نہ تھی، لیکن ان کی نجلی اور غیور طبیعت نے ان کو ملازمت کرنے پر آمادہ کیا۔ پہلے وزیر آباد ہائی اسکول میں سکنڈ ماسٹر مقرر ہوئے، پھر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں آگئے۔ اور وہاں سے ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر گونڈہ چلے گئے۔ چونکہ طبع آزاد پر ملازمت کی پابندیاں بار تھیں اس لئے ملازمت سے جلد سبکدوش ہو کر وطن آگئے۔

قانون کی تعلیم۔ ۱۹۰۵ء میں ام۔اے۔او کالج علیگڈھ میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۸ء میں ایل،ایل،بی کا ڈپلوما حاصل کیا۔

وکالت۔ لکھنو، آگرہ، اٹاوہ، بریلی اور بدایوں میں وکالت کی۔ ان کی قانونی قابلیت کا ہر جگہ اعتراف کیا گیا۔ لیکن فانی کو اس پیشہ سے کوئی لگاؤ کبھی پیدا نہ ہوا، چنانچہ اس پیشہ کی جانب بہت کم متوجہ ہوئے اور ماحول کی ناسازگاری ان کو کشاں کشاں لئے پھرتی رہی۔ فانی سب کچھ ہو سکتے تھے، لیکن کامیاب وکیل نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن قدرت کو یہ منظور تھا کہ یہ ناٹک کھیلا جائے اور فانی ایک ناکام اداکار کی طرح وکیل کا پارٹ ادا کرتے رہیں۔

حیدر آباد۔ زندگی کے آخری دور میں حیدر آباد پہنچے مہاراجہ کشن پرشاد شاد مرحوم نے ان کی قدر دانی فرمائی ریاست کے شعبۂ تعلیمات میں منسلک ہوکر ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوگئے۔ عمر زیادہ ہوچکی تھی تھوڑے ہی عرصہ بعد وظیفہ یاب ہونا پڑا۔ اُدھر مہاراجہ مرحوم چل بسے جو فانی کے سب سے بڑے قدر دان تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فانی کی عمر کا آخری زمانہ بڑی تکلیف اور عسرت میں بسر ہوا۔ ان کی رفیقۂ حیات مرچکی تھیں، خود فانی کی صحت جواب دے رہی تھی۔

وفات۔ تقریباً نو سال حیدر آباد رہنے کے بعد ۱۹۴۱ء میں دیارِ غیر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور حیدر آباد ہی میں سپردِ خاک کئے گئے۔

شادی۔ فانی کی شادی کے بارے میں عجیب عجیب افسانے تراشے گئے ہیں، خصوصاً ان کی مشہور غزل "قبرِ فانی دیکھتے جاؤ" کی شرحیں کی گئی ہیں اور ان کو قصہ طلب بنا دیا گیا ہے۔ یہ حاشیے افسانے سے زیادہ وقیع نہیں ہیں۔ خاندانی رواج کے مطابق ان کی شادی خاندان ہی میں ہوئی تھی اور ان کی ازدواجی زندگی بہت کامیاب اور خوشگوار تھی۔ ان کے دو لڑکے وجاہت علی خاں اور سعادت علی خاں حیدر آباد میں مقیم ہیں۔ ان کی لڑکی کا انتقال آگرہ کے دوران قیام میں ہوچکا تھا۔

عادات۔ فانی بہت خلیق، ملنسار، کم گو اور ہنس مکھ انسان تھے، لیکن انکی خودداری ان کے کردار کا نمایاں ترین جزو تھی، دولت تھی تو اس پہ

کوئی غرور یا بھروسہ نہ کیا، دولت ضائع ہونے پر ملول اور متردد نہ ہوئے عسرت کی حالت میں بھی اپنی قناعت و خودداری کو ہاتھ سے نہ دیا

شعر کہنے کا طریقہ ۔ شعر کہتے وقت ہمیشہ تنہائی پسند کرتے، اور زیادہ تر رات کے سناٹے اور خاموشی میں فکر سخن کرتے۔ شعر گوئی کے دوران میں ان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ۔ از خود رفتہ سے کچھ کھوئے کھوئے سے ہوتے ۔ کبھی آرام کرسی پر، کبھی لیٹے لیٹے شعر کہتے، شعر کہنے کے دوران میں ٹہلنے بھی لگتے اور ایک خاص کیف اور اثر کے ساتھ گنگناتے جاتے اور فکر کرتے جاتے ۔ اس عالم میں کبھی منہمک اور متفکر نظر آتے اور کبھی بشاش اور شگفتہ ہو جاتے اچھی غزل ختم ہونے کے بعد اکثر کئی کئی دن تک ان پر ایک سرور اور کیف کا عالم طاری رہتا وہ اپنے اشعار کئی کئی دن تک نہیں لکھتے تھے بلکہ زبانی ان کو پوری پوری غزلیں یاد ہو جاتیں اور گنگنا گنگنا کر ان میں رد و بدل کرتے رہتے ۔ لکھ کر کبھی شعر نہ کہتے ۔ ان کے شعر و شاعری کے انہماک سے خاندان کے بہت سے لوگ تنگ ہو جاتے تھے ۔ وہ خود بھی زیادہ ملنا جلنا کم پسند کرتے تھے، ملتے بھی تو صاف نظر حضرات سے جن کو شعر و شاعری کا ذوق ہوتا ۔ نہیں کو اپنے اشعار سناتے، ہر کس و ناکس کو اشعار سنانے سے پرہیز کرتے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فانی شعر کہتے وقت "اثر و کیف" کے لحاظ سے "مجسم شعر" یا "سراپا شعر" معلوم ہوتے تھے ۔ ان کے کلام میں جس قدر تشریت ہے اسی قدر تشریت ان کی شخصیت سے ہویدا تھی ۔

فانی کی سیرت

(محمد سبطین)

اگر یہ سچ ہے کہ شاعر کے افکار ماحول کے آغوش میں پلتے ہیں تو مرحوم فانی اس کلیئے کی زندہ تردید تھے۔ فانی نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو انگریزی مثل کے مطابق چاندی کا چمچہ منہ میں تھا۔ باپ پولیس کے عہدہ دار تھے اور اس پر مستزاد خاندانی جائداد کی آمدنی تھی جس کا تخمینہ چار پانچ سو روپیہ ماہوار کے قریب کیا جاتا ہے۔ عزت اور آسودگی جو خاندانی وجاہت اور اقتصادی فراغت کا نتیجہ ہوتی ہے! نہ صرف فانی کے گھر مہمان تھی بلکہ اپنے خاندان کے اکثر افراد کو میسر تھی، اعزا اور اقارب کی ناداری جو ایک نودولت گھر کو ریگستان کا نخلستان بنا دیتی ہے حوصلہ شکن ہوتی ہے۔ مگر فانی کے حوصلے پست کرنے کے لئے یہ صورت حال بھی موجود نہ تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزی پیدا کرنے بلکہ عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے وسائل آسانی سے مہیا ہو جاتے تھے۔ بے روزگاری نے ابھی جنم نہ لیا تھا اور مستقبل کی طرف سے وہ مایوسانہ ہراس جو نوخیز دماغوں پر اس وقت چھایا ہوا رہتا ہے۔ محسوس نہ ہوتا تھا۔ سیاسیات اور قومیات کے سمندر بھی ساکن تھے اور نہ ہوتے تو بھی فانی نہ وطن کے ایسے سیوک تھے نہ قوم کے پجاری کہ ملک و ملت کے غم میں خوشی کا منہ دیکھنا چھوڑ دیتے۔ خاندانی سیاسیات جو اکثر "زنا ہائے ثلاثہ" سے پیدا ہوتے اور الفتوں کو کدورتوں سے بدل کر زندگی کو عذاب بنا دیتے ہیں۔ نہ باپ کی زندگی میں رونما ہوئے نہ مرنے کے بعد۔ بلکہ بھائی نے تو خوردانہ اطاعت اور ایثار کا ہمیشہ وہ نمونہ دکھایا کہ بیسویں صدی میں عاقبت نااندیشی سے تعبیر کیا جائے گا۔ اور اسی طرح بی بی کی رضا جوئی ہمیشہ عبودیت اور بندگی کا رنگ اختیار کئے رہی۔

غرض فانی کے گرد و پیش جو حالات جمع تھے ان میں کہیں حزن و ملال کے آثار موجود نہ تھے۔ بلکہ ان کا تقاضہ تو یہ تھا کہ فانی کا ذکی دماغ اور بیقرار دل نئی نئی امنگوں سے مالا مال ہوتا۔ آرزوئیں کامیابی سے ہم کنار نظر آتیں اور امیدوں کے تازہ اور رنگین نقش زندہ و متحرک دکھائی دیتے۔ مگر توقعات کے خلاف، فانی عمر بھر سوگوار ہی بنے رہے۔ ازل سے ہی دل درد آشنا لے کر آئے تھے۔ افتاد

طبیعت نے ماحول کے تمام اثرات کو ٹھکرا دیا اور اپنا رنگ قائم رکھا۔ فانی کی زندگی میں طوفانی حوادث نظر نہیں آتے۔ انقلابات بہت ہیں، مگر خاموش، ہنگامے نہیں، محشر نہیں، وہ چیزیں نہیں جن سے داستانیں بنتی ہیں، اور کیوں ہوتیں، طبیعت میں دنیا اور متاع دنیا سے جب اتنی بے نیازی ہو جتنی فانی کو تھی، تو ہنگامے کیسے۔ ہنگامہ تو خواہش کی کامیابی یا تمنا کے خون سے پیدا ہوتا ہے۔ آرزو کی موجیں جب سر بہ فلک ہو جاتی ہیں تو سینۂ دریا تھرا اٹھتا ہے اور یہی دیو ہیکل، کوہ پیکر موجیں جب ٹوٹ کر گرتی ہیں تو سطح آب پہ لرزہ پڑ جاتا ہے، سینۂ ہستی دہل اٹھتا ہے۔ لیکن جو شخص دنیا میں "اختیار کی تہمت لئے ہوئے" آیا ہو اور اپنا فرض صرف یہ سمجھتا ہو کہ آنے والے واقعات کا انتظار کرتا رہے، طلب کا وہ جوش، نہیں دکھا سکتا جس کا مدو جزر، جس کا چڑھاؤ اور اتار دونوں اپنی اپنی جگہ ہنگامہ خیز ہوا کرتے ہیں۔

۱۸۷۹ء فانی کا سن پیدائش ہے۔ ۱۸۹۷ء میں انٹرنس اور ۱۹۰۱ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا، کچھ عرصہ تک مدرس اور کچھ دنوں ڈپٹی انسپکٹر رہ کر ملازمت کو خیر باد کہا۔ اور علیگڈھ کالج میں قانون پڑھنے کے لئے داخل ہو گئے۔ ۱۹۰۸ء سے وکالت کا سلسلہ شروع ہوا، لکھنؤ، بدایوں، بریلی، اٹاوہ، مین پوری، آگرہ، غرض کئی جگہ مختلف

زمانہ تک مقیم رہے ۔ آخر ۱۹۳۲ء میں مہاراجہ سرکشن پرشاد کی دعوت پر
حیدرآباد تشریف لے گئے اور راحت و اذیت کی دھوپ چھاؤں
زندگی گذار کر وہیں سپرد خاک ہوگئے ۔

مرنے والے کی مختصر روداد زندگی بس یہ تھی ۔ اس میں نہ تجربے
بڑے عزم تھے جن کی بلندی حیرت انگیز اور شکست عبرت آموز ہوتی ۔
نہ جدوجہد کی وہ شدت جو تلاطم خیز اور شورش افزا کہی جاتی ۔ فانی
کی زندگی ایک کشتی تھی، جو واقعات کی رو کے ساتھ کبھی ڈوبتی اور
کبھی اچھلتی، بلکہ اکثر ڈوبتی اور کم اچھلتی، بہتی رہتی ۔ مگر فانی کی طرف
سے منجدھار سے بچنے اور ساحل تک پہنچنے کی کوئی مجاہدانہ کوشش
ظہور میں نہ آئی یہاں تک کہ سفینۂ حیات اس گہرائی میں روپوش
ہوگیا جہاں ہر حرکت سکون سے بدل جاتی ہے ۔

سوانح حیات لکھنا مقصود نہیں، دیکھنا صرف یہ ہے کہ یہ
غم پرست شاعر کس شخصیت اور کردار کا حامل تھا ۔ فانی کی سب سے
بڑی خصوصیت جس پر ہر شاعر کو ناز ہونا چاہیے وہ یہ تھی کہ ان کا
کلام ان کی زندگی سے ہم آہنگ تھا ۔ ان کا شعر ان کی فطرت کا آئینہ
تھا ۔ فانی کی سیرت بیان کرنا اور ان کے دیوان پڑھ لینا ایک ہی
فائدہ رکھتا ہے ۔ اردو شعرا کے کلام میں یہ ہم آہنگی اب بھی کم پائی
جاتی ہے اور اس زمانے میں جب کہ فانی شعر کہتے تھے یعنی بیسویں
صدی کے ربع اول میں تو النادر کالمعدوم تھی ۔ معلوم نہیں شعر

کے لئے یہ حسن ہے یا عیب کہ وہ شاعر کے کردار کی صحیح تصویر ہو، مگر کم سے کم شاعر کے لئے ایسا کلام جو اس کی سیرت کو غلط رنگ میں پیش کرے اخلاقی گناہ ضرور ہے۔ مگر اب سے پہلے اردو غزل کے مباحث معین تھے۔ وہی گل و بلبل، ہجر و فراق، رندی و سرمستی، جنون و وحشت، اسیری و پرشکستگی، ہر شاعر کے قلم سے ادا ہوتے تھے۔

اس پابندی کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ غزل میں شاعر کی شخصیت بہت کم جھلکتی تھی۔ چنانچہ داغ اور میر کی سیرت کا اندازہ اگر ان کے کلام سے کیا جائے تو حقیقت سے کوسوں دور ہوگا۔

قید و بند کے اس عہد میں، شاید فانی ان چند نفوس میں تھے جن کے کلام کا مخصوص رنگ ان کے خیالات و جذبات کا صحیح عکس ہوتا تھا۔ فانی کا کلام غم، فانی کی حیات غم، یہ خصوصیت اس دور کے کسی اور شاعر میں ایسی صداقت کے ساتھ نہیں ملے گی۔ ان کا عقیدہ جبر صرف شعر میں نظم کرنے کے لئے نہ تھا، بلکہ ان کی زندگی اور ان کا عمل اس سے متاثر رہتے تھے۔ صورت بھی کچھ اسی افتاد طبیعت کے شایاں تھی۔ چھریرا بدن، دراز قد، کتابی چہرہ۔ خشخاشی ڈاڑھی آنکھوں میں غم، لبوں پر غم، سنجیدگی اور متانت کی تصویر مجسم، یہ مختصر حلیہ تھا اس ذات کا جس نے عمر بھر زندگی کا ماتم کیا اور اب جس کا ماتم اردو ادب زندگی بھر کرتا رہے گا۔

غم دوستی فانی کی سیرت کا جزو لاینفک تھی۔ مگر اس ساز کو

چھیڑنے کے لئے ایک مضراب کی ضرورت ہے، غم، غم محبت ہو تو نالے دلکش اور آنسو رنگین ہو جاتے ہیں۔ درد کی چبک میں لذت پیدا ہو جاتی ہے۔ لکھنو کے قیام میں" دولت دوجہاں" کا یہ نعم البدل یعنی دل مبتلا نصیب ہو گیا۔ فانی کے بعض اعزا کو اصرار ہے کہ ان کا دامن محبت کے داغ سے پاک رہا۔ لیکن شعر کا سوز و گداز خود غماز ہے اور اس کے علاوہ بہت سے لوگ جو فانی کو قریب سے دیکھتے اور مدت سے جانتے تھے شہادت دیتے ہیں کہ واردات سے ان کا قلب خالی نہ تھا۔ حسن و عشق کے رنگین معاملات سے وہ آشنا رہے تھے۔ یہی کشش بار بار لکھنو کی طرف کھینچتی تھی۔

کراموِل نے اپنے مصور سے کہا تھا کہ میرے چہرے کے خراش اور شکنیں نہ دکھاؤ گے تو اجرت نہ دونگا، اسی طرح فانی کی روح بھی شاید یہی پسند کرے گی کہ ان کے مداح ان کے کردار کی صحیح تصویر محفوظ رکھیں اور اس کے داغ مٹانے کی کوشش نہ کریں، ورنہ وہ تصویر فانی کی تصویر نہ ہوگی، لیکن جو شخص فانی کی اس کمزوری کو رسوا کرتا ہے۔ اس کا اخلاقی فرض ہے کہ اس رشتۂ محبت کی اصلی نوعیت کو بھی ظاہر کردے۔ چنانچہ یہ واقعہ مسلم ہے کہ فانی کو بوالہوسی اور حظ پسندی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ درحقیقت وہاں تو ایک محراب ابرو کی ضرورت تھی جہاں نمانہ عشق ادا ہو سکے۔ ایک بت کا آستان درکار تھا، جہاں غم محبت لہو کی چند بوندیں نذر کر سکے۔ یہی سبب تھا کہ اس تعلق نے فانی کی متاہل

زندگی پر کوئی ناگوار اثر نہ ڈالا۔ ان کے ازدواجی تعلقات نہ صرف اختلاف مزاج اور بدگمانی کی تلخیوں سے پاک رہے، بلکہ اس کے برعکس لطف ومحبت کی شیرینی سے آشنا تھے اور اس کا ذمہ دار خود فانی کے علاوہ ان کی رفیقۂ حیات کا صبر و ایثار بھی تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ آخر زمانہ میں بی بی سے اتنا لگاؤ بلکہ وابستگی محسوس کرنے لگے تھے کہ جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکے، وہ نیک بخت خاتون، جنت کو سدھاری تو ایک ہی سال کے اندر فانی بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

فانی شاعر تھے اور حقیقی شاعر۔ لیکن آج کل ہم جب کسی شخص کی نسبت یہ سنتے ہیں کہ اس کا شمار شعرا میں کیا جاتا ہے تو ہمارا ذہن بغیر ہماری کاوش و کوشش کے چند خصوصیات کو اس کی ذات کے ساتھ منسوب کر دیتا ہے۔ چنانچہ تصنع، تکلف، خودستائی، زود رنجی، نکتہ چینی، زر طلبی اور اس قسم کی چند مثالیں اور ادائیں ہر شاعر کی ذات میں قدر مشترک کی حیثیت سے جمع نظر آتی ہیں۔ لیکن ان سب سے نمایاں، سب سے بالاتر ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ شاعر شہرت کا بھوکا ہوتا ہے۔ ہر جگہ اپنا اشتہار چاہتا ہے۔ یا اگر اس جنس کمیاب کا معقول ذخیرہ حاصل ہو چکا ہے تو بڑی شدت کے ساتھ اس کے تحفظ میں ساعی رہتا ہے۔ اور ہر آن یہ دیکھتا ہے کہ دوسروں کا قول و فعل اس کی مسند عظمت کو کہیں صدمہ تو نہیں پہنچاتا۔

شاعر کی اس تعریف سے فانی مستثنیٰ تھے۔ ان خصوصیات میں

سے ایک بھی ان میں موجود نہ تھی۔ اور آخرالذکر جو دوسروں میں سب سے زیادہ شدت کے ساتھ پائی جاتی ہے ان میں اسی قدر شدت کے ساتھ مفقود تھی۔ بلکہ اس کی ضد یعنی گمنامی کی آرزو اور خود نمائی سے نفرت اسی قدر قوت کے ساتھ کارفرما نظر آتی تھی۔ مشاعرے کی شرکت بھی ناگوار تھی اور آخر زمانے میں تو بہت پرہیز کرنے لگے تھے۔ مشاعرہ کیا ہر ہنگامے سے گھبراتے تھے۔ جلسوں اور محفلوں میں بہت کم جاتے تھے۔ رسالوں کے ایڈیٹر جن کا تقاضہ سعدی کے زمانے کے قصاب یا اس دور کے سود خوار "خان" سے زیادہ زشت و درشت ہوتا ہے، فانی پر بڑی شدت کے ساتھ حملہ آور ہوتے تھے لیکن فانی کبھی اخلاقاً کوئی غزل دیتے بھی تھے تو بہ ہزار کراہت کہا کرتے تھے کہ شعر اپنا دل خوش کرنے کے لئے کہتا ہوں نہ کہ داد و شہرت کے لئے۔

ڈاکٹر راس مسعود مرحوم نے انتخاب دریں کی تالیف کے وقت بیسوں خط لکھے اور چاہا کہ فانی کچھ حالات لکھ بھیجیں مگر اس بندۂ خدا نے کروٹ نہ لی، ایک مرتبہ کلکتہ گئے نواب نصیر حسین خیال کے مہمان ہوئے، نواب صاحب مرحوم نے فانی کی آمد میں ایک شاندار ضیافت شعر و سخن کی ایک عام صحبت کا انتظام کیا۔ شام کو نواب صاحب کی موٹر میں فانی سیر کو نکلے تو دیکھا کہ "سبزہ زار ہائے مطرا" اور "نازنین بتاں خود آرا" کے اس شہر میں دیواروں پر اشتہار نظر آتے ہیں، جن میں یہ اعلان ہے کہ فانی کی آمد کی تقریب میں ایک مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے

بس چند مقامات دیکھنے کے بعد شوفر سے کہا کہ اسٹیشن چلو اس نے تعمیل حکم کی۔ چنانچہ بستر، سامان، مشاعرہ، ضیافت، طعامہائے مرغن اور میوہ ہائے شیریں سب چھوڑ کر گاڑی میں سوار ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ خود نمائی اور شہرت سے بے نیازی اتنی بڑھ گئی تھی کہ بعض اوقات فانی مروت اور اخلاق کو بھی بھول جاتے تھے۔ ایک بار سہارنپور میں مشاعرہ ہو رہا تھا لوگوں کو فانی کا بڑا اشتیاق تھا چنانچہ فانی کے ایک قریبی عزیز کو جو وہیں عدالت ججی میں منصرم تھے واسطہ بنا کر دعوت دی گئی۔ فانی نے منظور بھی کر لی۔ سفر خرچ بھی پہنچ گیا۔ لیکن جب استقبال کرنے والے کئی مرتبہ اسٹیشن کے طواف کر چکے تو منی آرڈر کے ذریعے سے سفر خرچ کی رقم اور فانی کا انکار موصول ہو گیا۔

لیکن جہاں نام و نمود سے یہ احتراز تھا وہیں فانی میں بعض ادائیں انفرادیت اور انانیت کا رنگ لئے ہوئے تھیں، جو ان کو دوسروں سے ممتاز کر دیتی تھیں، ان کا طرز بود و باش اور ان کا انداز گفتگو کچھ ایسا ستھرا، متین اور عامیانہ روش سے علیحدہ تھا کہ خواہ مخواہ ہر شخص ان کی طرف دیکھنے، ان کے امتیازی رنگ کو محسوس کرنے، بلکہ ان کی عظمت کا اعتراف کرنے کے لئے مجبور ہوتا تھا۔ لباس میں تکلف ہوتا تھا۔ مکان بہت آراستہ رکھتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ بہتر سے بہتر مکان کرائے پر لیں۔ مردانے میں آتے تو کبھی بغیر اچکن پہنے نہ آتے۔ بات کرتے تو آہستہ، غصہ کبھی نہ آتا۔ بازاری الفاظ اور سوقیانہ کلمے کبھی منہ سے

نہ نکلتے۔ کہیں ہوتے ہر صحبت میں نمایاں نظر آتے، ہر جلسے میں صدر نشین معلوم ہوتے، شعرا کی قوم میں بہت سے زیادہ گو اور مغرور لوگ ہوتے ہیں، مگر فانی کا طرزِ گفتگو بڑے بڑے خود سروں کو ان کی شخصیت کا احترام کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ فانی متکبر تھے۔ انکسار ان کی سیرت کی نمایاں خصوصیت تھی۔ غرور، خود ستائی اور تعلی سے وہ کوسوں دور تھے۔ عیدی پڑھنے والا نوشق بھی ان سے ملتا تو یہ نہ محسوس کرتا کہ اپنی برتری کا ذرا سا بھی خیال ہے۔ اس منکسر مزاجی کا ثبوت خود ان کے کلام میں موجود ہے۔ تعلی اور مباہات شعرا کا عام شیوہ تھا۔ اب یہ رواج متروک سا ہو گیا ہے، لیکن پہلے تعلی نہ صرف جائز بلکہ قابلِ تحسین سمجھی جاتی اور شعر کے معین مقرر مضامین میں داخل تھی۔

خصوصیت کے ساتھ اس مضمون کے واسطے مقطعے وقف رہتے تھے۔ فانی کے معاصرین اس روایت قدیم کے حامل تھے۔ مثلاً

حسرت تری اس شگفتہ کلامی کو آفریں
یاد آ گئیں نسیم کی رنگیں بیانیاں

یہ تغزل ہو جو کچھ دوں ہوں، عزیز
آفتابِ مشرقستانِ خیال

لیکن فانی کا کلام تعلی سے یکسر پاک نظر آتا ہے۔ وہ مقطعے کو بھی شعر رکھتے تھے۔ اس باب میں ان کو مومن خاں کا متبع سمجھنا چاہیے۔

دونوں نے جابجا اپنے تخلص سے خوب خوب کام لیا اور تخلص کی رعایت سے نئے نئے مضمون پیدا کئے پھر بھی مومن خاں روشِ عام سے نہ بچ سکے اور دو ایک مقطعوں میں شاعرانہ تعلّی کا اظہار کر گئے۔

سُن رکھو، سیکھ رکھو، اس کو غزل کہتے ہیں
مومن اسے اہلِ فن اظہارِ ہنر کرتا ہے
عبث ترقیِ فن کی ہوس ہے مومن کو
زیادہ ہوئے گا کیا اس سے بے مثال تو ہے

ان مستثنیات سے قطع نظر مومن کے مقطعوں کا عام موضوع کفر و دین کے مضامین ہیں، اسی طرح فانی کے مقطعے موت و حیات کے مسائل سے بحث کرتے ہیں۔ ایک دو جگہ کسی ذاتی واقعے کی طرف اشارہ کر گئے ہیں، مگر فخر و مباہات کے پاس نہیں پھٹکتے۔

یہ نہیں کہ فانی کو اپنے مرتبے کا احساس نہ ہو۔ وہ شعر کہتے تھے تو شعر سمجھنے کی بھی اہلیت رکھتے تھے۔ اپنے کلام کا خود ہی انتخاب کرتے تھے۔ فارسی شعرا کے صدہا شعر یاد تھے اور جب کبھی شعر کا مطلب بیان کرتے تو بڑی طویل تقریر فرماتے۔ لہٰذا بڑی نادانی ہوگی اگر یہ سمجھا جائے کہ فانی کا تعلّی سے گریز کمال سے بے خبری پر مبنی تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس باکمال کو اللہ نے فطرتاً منکسر المزاج بنایا تھا اور اس کو اپنی شہرت کا ڈھول پیٹنے سے بالطبع نفرت تھی۔

شہرت کی طرح فانی دولت کی طرف سے بھی بے نیاز تھے ان کے نزدیک زندگی سود و زیاں کے اندیشے سے برتر چیز تھی۔ ہمارے ہاں شاعر بہت ہیں کچھ وہبی کچھ کسبی۔ مگر کوئی شاعر ہر وقت شاعر نہیں رہتا دن رات میں کم سے کم چند ساعت کے لئے وہ تخیل کے حسین و جمیل فردوس سے اس کرۂ خاک پر اتر آتا ہے۔ اس وقت وہ اس جہانِ داد و ستد میں دوسرے ابنائے جنس کی طرح بیش و کم اور من و تو کا فرق محسوس کرتا ہے۔ اپنے پرائے کا امتیاز رکھتا ہے اور سود و زیاں کے کانٹے سے معاملات کو تولتا ہے۔ لیکن فانی کی شان یہ تھی کہ شعریت کے ملاءِ اعلیٰ سے اس خاکدان کی طرف توجہ کرنا بھی گناہ سمجھتے تھے انتہا یہ تھی کہ وہ دستاویزیں جن کے ذریعے سے بیع و رہن کے معاملات طے ہوتے تھے کبھی پڑھتے بھی نہ تھے اور دستخط کر دیتے تھے۔ ساری عمر سود خوار ساہوکاروں کا نشانۂ ستم بنے رہے، لیکن اس غیور انسان نے کبھی گوارا نہ کیا کہ اس کی رسوائی عدالت کے احاطے تک پہنچے اور "کوئی شوکت علی خاں حاضر ہے" کی آواز اس کی بے مائیگی کا راز افشا کرے، چنانچہ زندگی بھر نالش کی نوبت آنے نہ دی۔ اور جس طرح ممکن ہوا ساہوکار سے ہر قیمت پر فیصلہ کر لیا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جائداد کو زیادہ سے زیادہ اپنے قبضے میں رکھنے کے بجائے جلد سے جلد بیع کرنا پڑا۔ تباہی کی رفتار تیز سے تیز تر ہو گئی، جب اثاثہ ختم ہو چکا اور فقر و فاقہ کی کٹھن منزل

آئی تو بھی اس غیرت مند انسان نے کسی دوست یا عزیز سے ہمدردی طلب کی نہ امداد - اس کی آن بان افلاس میں بھی وہی تھی جو ثروت میں رہتی تھی ۔ وہ اپنے غم میں مست رہتا تھا - فانی کی دولت دل مبتلا تھا اور کچھ نہیں -

مجھ کو مرے کریم نے روز ازل نہ کیا دیا

دولتِ دوجہاں نہ دی اِک دلِ مبتلا دیا

جائداد کی یہ تباہی بڑی سرعت کے ساتھ عمل میں آئی - اور اس کا سبب صرف وہ مآل نااندیشی تھی جو متنبہ ہونا نہیں جانتی - روپیہ جب پاس ہوتا فانی شہزادوں کی طرح خرچ کرتے - لکھنؤ وکالت کرنے پہنچے تو سوا سو روپیہ ماہوار کی کوٹھی کرائے پر لے رہے ہیں - بمبئی کا سفر اختیار کیا تو معہ اہل وعیال فرسٹ کلاس میں چلے اور چند ہی روز میں کئی ہزار پھونک دیئے - آبائی ورثہ انہیں اولوالعزمیوں کی نذر ہوگیا - ساہوکار اصل سے دس گنا سود وصول کرتے تھے اور دینا پڑتا تھا - بدایوں میں اور بھی گھرانے ہیں جو اسی طرح برباد ہوئے، لیکن ثروت سے تہیدستی تک سارے مراحل جس قدر تیزی کے ساتھ فانی نے طے کئے اس کی نظیر کم ملے گی - آخر زرعی جائداد کے بعد سکنی جائداد کی باری آئی - ایک دن جب کہ فانی کا مکان جو شہر کے بڑے مکانوں میں پہلا یا دوسرا نمبر رکھتا تھا ایک قرضے کے سلسلے میں معرض زوال میں تھا فانی نے ایک شعر کہا تھا اور کس قدر حسب حال کہا تھا -

اپنے دیوانے پہ اتمامِ کرم کر یا رب
در و دیوار دیئے اب انہیں ویرانی نے

کارل مارکس کے مذہب سے یہی انحراف کلی وکالت میں ناکامی کا سبب ہوا۔ فانی کے نزدیک گھر سے کچہری تک جانا اتنی بڑی مصیبت تھا کہ محنتانہ کی کوئی رقم اس کا بدل نہ ہو سکتی تھی، چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ کچہری کے قصد سے دروازے تک آئے: دھوپ کی تمازت دیکھ کر لاحول ولا قوۃ الا باللہ فرمایا اور پھر گھر میں چلے گئے یا کچھ مہمان آ گئے اور شعر و سخن کی محفل گرم ہو گئی تو کچہری میں بستر سونا پڑا اور پھر وزنی مقدمات کا محنتانہ موکلوں کو واپس کر دیا گیا، جس روز کوئی مقدمہ نہ ہوتا، گھر سے کچہری نہ جاتے۔ کوئی اصرار کرتا تو کہہ دیتے کہ چارپائی سے زیادہ آرام کہیں نہیں ملتا۔ اٹاوہ میں ایک ڈپٹی کلکٹر بڑے قدر شناس تھے اور چاہتے تھے کہ فانی کو احتیاج کی صورت نہ دیکھنا پڑے۔ چنانچہ ایک اردلی کی مستقل خدمت یہ تھی کہ وکیل صاحب کو گھر سے کچہری بھیجے مگر ان تمام اہتمامات پر بھی حاضری کا اوسط وہی تھا۔ نہ احباب کی فہمائش فانی کی تہی دستی کا علاج کر سکتی تھی نہ حکام کی نوازش جو شخص خود کہتا ہو کہ میں کچہری اور بیت الخلا بڑی مجبوری سے جاتا ہوں۔ اس کے لئے بار در دم میں کوئی کشش پیدا کرنا انسانی طاقت سے باہر تھا۔ پھر بھی تحقیق یہ ہوا ہے کہ یہ رند لم یزل جب کسی مقدمے کی پیروی کرتا تھا تو ذہانت، فطانت، اور قانونی فراست کا حق ادا کر دیتا تھا۔

کسبِ زر سے یہ بے اعتنائی ہی ان کی تمام اذیتوں کا باعث
تھی۔ جن کو فانی اپنی اصطلاح میں سکون و راحت کہا کرتے تھے۔ وحشتِ دل
کھینچے یا سعیِ رائیگاں جگہ جگہ لیے لیے پھری کبھی لکھنؤ رہے کبھی اٹاوہ کبھی آگرہ
پہنچے کبھی دکن مگر بُرے دن نہ پھرے۔ وہ سمجھتے تھے ایک اٹل مشیت نے
کارکنانِ قضا و قدر کو اس امر پہ مامور کر دیا ہے کہ فانی کا کوئی کام نہ بننے
پائے۔ کہا کرتے تھے کہ گاڑیاں ہمیشہ وقت پہ آتی ہیں وقت پہ جاتی ہیں
مگر میں جب کبھی سفر کرتا ہوں گاڑی نہ وقت پہ آتی ہے اور نہ جاتی ہے۔
ان کا کلام شاہد ہے کہ اپنی مجبوری اور محرومی پر ان کا اعتقاد کس قدر
راسخ تھا۔ ایسی صورت میں سعیٔ للبقا کی امید کیا ہو سکتی تھی۔ وہ تو ایک سپر
انداختہ سپاہی تھے جو حادثات کے سامنے سر خم کر دینے کے لیے ہر وقت
تیار کھڑے رہتے تھے۔ اس پہ مستزاد ان کی خودداری تھی جس کو کسی کا
احسان گوارا کرنا تو درکنار یہ تو منظور ہی نہ تھا کہ حرفِ شکایت زبان پہ
آجائے، جس زمانے میں معظم جاہ بہادر کے ہاں آمد و رفت تھی ایک روز
شاہزادے نے کہا کہ فانی صاحب آپ کے لڑکے کیا کرتے ہیں۔ ان کے
لیے کچھ بند و بست کیا جائے۔ یہ وہ موقعہ تھا کہ زندگی بن سکتی تھی، لیکن فانی
نے جواب دیا کہ ان کے لیے خدا کی ذات کافی ہے۔

لے وائے بر دلِ من و مضطر دلِ زیستن

فانی اُن شعرا میں سے تھے جو پیدا ہوتے ہیں بنتے نہیں۔ چسکا بچپن ہی
سے لگ گیا تھا۔ مگر باقاعدہ تلمذ کا شرف کسی سے حاصل نہ کیا۔ البتہ آپ

کے بڑے عاشق اور بیدل کے بڑے مداح تھے۔ اکثر غزلیں غالب کی زمینوں میں موجود ہیں، بعض جگہ غالب ہی کے خیال کو نئے قالب میں ڈھال لیا ہے۔ بعض جگہ ترکیبیں اور اسالیب بیان بالکل یکساں ہیں۔ مثالیں عرض کی جائیں تو مضمون کے موضوع سے انحراف ہوتا ہے۔ کہا کرتے تھے کہ میں نے غالب سے روحانی فیض حاصل کیا ہے کلام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حسرت کے رنگ غزل خوانی سے بھی بہت متاثر تھے۔ ہم زمین و ہم قافیہ غزلیں اس تاثر کی گواہی دیتی ہیں۔ بلکہ بیان کیا جاتا ہے کہ دونوں آخر کے ان دو سحر نگاروں میں بڑے پُرخلوص تعلقات تھے۔

اسی سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ معترضین کی طرف اس بے نیاز سخنور نے کبھی التفات نہ کیا۔ دنیائے شاعری میں یہ ایک قانون قدرت ہے کہ آسمان شہرت پر طلوع ہونے والے ہر ستارے کا خیر مقدم تنقید سے کیا جاتا ہے۔ اور یہ تنقید تنقید نہیں بلکہ تنقیص ہوتی ہے۔ اور بدایوں خصوصاً ان روایات کا گہوارہ تھا۔ بلکہ کچھ زمانہ گذرا جب تک باقاعدہ گروہ بندی قائم تھی۔ اکھاڑے الگ الگ قائم تھے۔ مشاعرے میں ہر استاد اپنے پٹھوں کو ساتھ لے جاتا تھا۔ غزل ہاتھ میں ہوتی تھی غصہ ناک پر۔ مشاعروں کی نوک جھونک کبھی کبھی اخباروں اور رسالوں کے صفحوں پر مرتسم نظر آتی تھی۔ لہذا ہر شاعر کو تبرا لکھنے کی مشق بھی کرنا پڑتی تھی۔ مگر فانی نے اس صنف سخن کی طرف کبھی التفات نہ کیا۔ اہل وطن

نے بھی کرم فرمایا اور بیرونی حضرات نے بھی۔ احباب نے جواب دینے پر اصرار بھی بہت کیا۔ مگر نہ خود کبھی جواب لکھا نہ معتقدین کو اجازت دی البتہ ایک مرتبہ جب کے ان کے خلاف اٹاوہ کے ایک بزرگ نے مضامین کا ایک مستقل سلسلہ شروع کر دیا تھا تو بہ ہزار جبر و اکراہ جواب میں معترض اور مدیر دونوں کا شکریہ لکھ بھیجا۔

آخر جب یہ ستارہ آفتاب و ماہتاب ہوگیا تو طعن و ملامت کی زبان خود بند ہوگئی۔ اب فانی کا شاگرد ہونا اعزاز سمجھا جانے لگا مگر فانی شاعر تھے نہ کہ دوکان دار، انہیں شاگرد بنانے کی چڑ تھی۔ اگر کوئی سر ہو جاتا تو غزل سن لیتے اور الفاظ یا مصرعے جن میں عیب نظر آتا بدل دینے کا مشورہ دیدیتے۔ شاگرد خود ہی اصلاح کرتا اور پھر سناتا۔ اس عمل کو بار بار دہرایا جاتا، یہاں تک کہ غزل بن جاتی۔ فانی کے ایک شاگرد کہا کرتے ہیں کہ استاد سے کوئی شعر یا مصرعہ ملنے کی حسرت ہی رہ گئی۔

فانی کی شعر گوئی کا انداز بھی مختلف تھا۔ ٹہلتے جاتے تھے اور گنگناتے جاتے تھے اس طرح ایک ایک دو دو کرکے چند اقساط میں غزل پوری کر لیتے۔ مگر شعر کم لکھتے تھے اور اس لئے انتخاب کا عمل مختصر اور آسان ہوتا تھا۔ شعر سنانے سے حتی الامکان گریز کرتے مگر جب کوئی شاعر مل جاتا تو سننے کے لئے حد سے زیادہ مصر ہوتے۔ اور اچھے شعر پر بڑی فراخ دلی سے داد دیتے۔ بعض دفعہ تڑپ اٹھتے

بار بار پڑھواتے اور سر دھنتے۔ خود سناتے تو ایک عجیب پر گداز ترنم کے ساتھ پڑھتے۔ موسیقی جانتے تھے، مزامیر سے بھی شوق رہا تھا، مگر جس وقت غزل سناتے تھے تو عجیب فطری لحن کے ساتھ پڑھتے تھے آواز بلند نہ تھی مگر بڑی دلکش تھی۔ پڑھتے وقت نہ تو فن دانی کی شان تصنع ظاہر ہوتی تھی اور نہ وہ بے سُرا پن جو فن کی ناواقفیت سے پیدا ہوتا ہے۔ داد لینے کے لئے نہ شعر پڑھنے کے بعد ٹھیرتے نہ شعر کی تکرار کرتے۔ ایک مصرعہ کے بعد دوسرا مصرعہ اور ایک شعر کے بعد دوسرا شعر جلد سے جلد پڑھنے کی کوشش کرتے اور کم سے کم وقت میں اپنا پارٹ ادا کر جاتے۔ ایک مشاعرے میں، فانی غزل پڑھ چکے تو ایک زندہ دل کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ فانی صاحب، معاف کیجئے معاف آپ کی غزل میں ایک بڑا عیب ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جلد ختم ہو جاتی ہے فانی مسکرا دیئے۔

ہندوستان کے اردو شعرا آج کل ایک خانہ بدوش قوم ہیں۔ ان کا وطن کہیں نہیں، سال بھر مشاعروں میں رہتے۔ آج یہاں ہیں تو کل وہاں۔ مگر آوارگی کی یہ سعادت اکثر انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو شعر کو ترنم کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں، فانی کو اس نعمت سے کافی حصہ ملا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ مشاعروں میں پابہ دست دگرے دست بدست دگرے جانا پڑتا تھا۔ فانی کا اخلاق ان کی فطرت پر غالب آجاتا تھا اور جاتے تھے۔ مگر مشاعرے کی رات جاگنے کا جرمانہ کئی ہفتہ تک ادا کرنا پڑتا۔

پھر بھلا فانی کی نازک مزاجی ان صبر آزما اور تاب شکن صحبتوں کی متحمل کیا ہوتی جو مشاعرے سے قبل اور مشاعرے کے بعد مقامی اور غیر مقامی شاعر صحت اور فرصت سے انتقام لینے کے لئے منعقد کیا کرتے ہیں۔ بڑے مشاعروں کے موقعہ پر تو سننے سنانے کا یہ مشغلہ ریل کے سفر ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اور واپسی کے سفر تک جاری رہتا ہے۔ پیشہ ور شعرا کو یہ مصروفیت خواب و آرام اور خورد و نوش سے کہیں زیادہ صحت بخش ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ دس یا پانچ غزلیں سنا لینے کے بعد عرض ہنر کی ٹیس کم ہو جاتی ہے۔ مگر فانی کسی مشاعرے کی شرکت کے لئے چلتے تو ایسی گاڑی پسند کرتے جس سے کوئی دوسرا اہم مشرب سفر نہ کر رہا ہو۔ ایک بار یوپی کے مشاعرے میں جا رہے تھے۔ ٹونڈلا جنکشن کے ویٹنگ روم میں گاڑی کا انتظار کرتے کئی گھنٹے گذر گئے تھے۔ ایک ایک منٹ دوبھر تھا۔ خدا خدا کر کے گاڑی آئی۔ مگر فانی نے پہلے ایک رفیق سفر کو یہ دیکھنے کے لئے بھیجا کہ اس گاڑی سے اور کوئی شاعر تو نہیں جا رہا ہے معلوم ہوا کہ ساغر و سیماب چل رہے ہیں۔ اس اطلاع کے بعد فانی نہ ویٹنگ روم سے باہر نکلے نہ اس گاڑی سے تشریف لے گئے کہنے لگے کہ مشاعرہ یہیں سے شروع ہو جائیگا۔ اور مجھ کو اس کی تاب نہیں۔ ساتھیوں کو شاق گذرا مگر نازک مزاجی کا خوف ایسا تھا کہ کچھ نہ کہہ سکے۔ مختصر یہ ہے کہ فانی میں شاعروں کی سی کوئی بات نہ تھی بجز اس کے کہ شعر کہتے تھے اور چائے بہت پیتے تھے۔

افسوس ہے کہ فانی کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ ابتدا میں جو کچھ کہا اور جمع کیا تھا والد بزرگوار نے نذر آتش کر دیا۔ پھر ۱۹۰۶ء میں دوبارہ کلام جمع کیا وہ چوری ہو گیا۔ آگرہ چھوڑتے وقت سامان کے ساتھ فارسی دیوان بھی ایک کرائے کے مکان میں مقفل کر گئے تھے۔ چنانچہ سامان کے ساتھ دیوان بھی ضائع ہوا۔ مگر با ایں ہمہ جو کچھ چھوڑا وہ ان کو حیات دوام بخشنے کے لئے کافی ہے۔ فانی کے کلام کی نسبت بھی دنیا کے ہر مسئلے کی طرح دو رائیں ہیں۔ ایک گروہ ان کی عظمت کا قائل، ان کے کمال کا معترف ہے اور اردو ادب میں ان کو ایک بلند اور مستقل مرتبہ کا مستحق قرار دیتا ہے۔ اور دوسری طرف ایک جماعت ہے جو فانی کا نام سن کر چیں بہ جبیں ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ شاعری صرف عزاداری کا نام نہیں، فانی کے ہاں سوا یاس اور ماتم کے اور کچھ بھی نہیں ملتا۔ شعر میں سوزِ آرزو نہیں تو زندگی ہی مفقود ہے اور ایسا کلام نہ حسین ہوتا ہے اور نہ مفید۔

فانی کی نسبت یہ دو متضاد رائیں رکھنے والے دونوں گروہ بہرحال اس امر کو متفقہ طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ جہاں تک سلاست، ہمواری، متانت اور فنی صناعی کا تعلق ہے فانی کو آخری دور کے شعرا کی صفِ اول میں جگہ ملنی چاہیئے۔ فانی نے غزل لکھی ہو یا مرثیہ، موت طلب کی ہو یا زندگی، مگر اس سے کس کو انکار ہے کہ وہ دل آویز ہے، دلکش ہے، دل دوز ہے۔ ممکن ہے تنوع کا فقدان، موضوع

کی یک رنگی بعض طبائع کو ناگوار ہو، لیکن شاعر نے وہی کہا جو محسوس کیا اور احساس و بیان کی یہ ہم آہنگی، شاعر کی صداقت کی دلیل اور صداقت اثر کی ضامن ہے۔

اس مضمون کا مقصد نہ تبصرہ ہے نہ محاکمہ، لیکن فانی کا کلام پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک غضب کا اداکار اسٹیج پر کھڑا ہے۔ اور اس کے پیچھے پردہ پر دنیا کی رنگا رنگی نقش ہے۔ زندگی کی ہر شان و حالت نظر آتی ہے۔ مغموم کے نالے اور مسرور کے ترانے، حسن کی رعنائی اور محبت کی رسوائی، غریب کی بے بسی اور تونگر کی بے دردی، مگر اداکار ہے کہ تماشائی کو اپنے سوا کسی دوسری طرف نظر اٹھانے کی فرصت ہی نہ دیتا، اس کا اپنا شیلون اس قدر دلکش ہے اور اس کا فسانۂ غم اتنا طویل کہ نہ وہ خود کسی طرف التفات کرتا ہے نہ دوسروں کو اتنی مہلت دیتا ہے۔ آپ فانی کی کوئی غزل پڑھیئے، صرف فانی آپ کے سامنے ہوں گے۔ اور ساری دنیا نظر سے اوجھل۔ دوسرے شعرا برخلاف اس کے کبھی خود سامنے آجاتے ہیں کبھی صحیفۂ کائنات ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ ہماری آنکھوں میں اپنی نظر رکھ کر ہمارے دل میں اپنے محسوسات بٹھا کر خود ہٹ جاتے ہیں، مگر فانی اسٹیج سے نہیں ہٹتا وہ ہر وقت خود سامنے ہے اور صرف اپنا ہی دکھڑا سنانا چاہتا ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ صرف مجھ ہی کو دیکھو، میری ہی سنو، یہ خودنمائی، یہ خود پرستی معلوم نہیں کیونکر اس فنا طلبی اور حجاب پسندی سے مربوط ہوتی

ہے جو فانی کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

فانی شاعر تو اچھے تھے ہی، وہ ہر حیثیت سے قابل قدر انسان بھی تھے۔ باپ، تھے تو شفیق، شوہر تھے تو جاں نثار، دوست تھے تو یار، شاطر نہ کہ بار خاطر۔ صرف ایک حیثیت سے وہ ناکام رہے ایک بار سا تھا جو وہ ادا نہ کر سکے۔ وہ فرزند کا سب نہ بن سکے۔

زندگی کے آخری زمانے میں فانی کی مصیبتیں انتہا کو پہنچ گئیں، مہاراجہ کشن پرشاد مرحوم جن کی سرپرستی کی بدولت گزر ہو رہی تھی۔ انتقال کر گئے ادھر تعلیمات کی ملازمت ختم ہو گئی۔ اسی زمانے میں بی بی نے طویل علالت کے بعد انتقال فرمایا۔ لڑکوں کی طرف سے پہلے ہی مایوسی ہو چکی تھی۔ اب فانی کی گزر یا تو اس حقیر اور غیر معین آمدنی پر تھی جو گاہے گاہے نشرگاہ سے ہو جاتی تھی یا محض توکل پر۔ فانی کے جاننے والے گواہ ہیں کہ صبر و رضا، تحمل و توکل کا یہ پیکر مجسم کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتا تھا۔ کبھی امداد کا طالب نہ ہوتا تھا۔ کبھی احتیاج کا اظہار نہ کرتا تھا۔ لیکن آخر بشر تھا۔ متزلزل ہو گیا۔ غالب پہلے ہی لکھ چکے تھے۔

زندگی اپنی گر اس رنگ سے گذری، غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے،

اسی تخیل کی رہبری میں ایک فارسی رباعی قلم سے تراوش کر گئی

اوانہ جہاں گزشت کہ آخر خدا نبود ۔۔۔ اور آنچناں بزیست کہ گوئی خدانداشت
طغیانئ نازبیں کہ لوح مزار او ۔۔۔ ثبت است سال رحلت فانی خدانداشت

اس رباعی سے غلط فہمیاں پیدا ہوئیں، لیکن فانی کی زندگی کا عمل ان شبہات کی تردید کرتا ہے۔ بعض مرتبہ ان کی خلوتیں تسبیح و مصلیٰ سے آراستہ رہا کرتی تھیں اور یہ باور کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ وہ شخص جس کو زندگی میں وجودِ حقیقی کا ایسا پختہ عرفان حاصل رہا ہو۔ جس نے ہمیشہ سپردگی اور نفیِ حیات کے نغمے گائے ہوں اچانک کفر کے گڑھے میں گر پڑے۔

فانی کا کلام پڑھنے کے بعد ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ شکوے کرنے کے لئے گردشِ چرخ اور جورِ صیاد کے علاوہ فانی کے مخصوص مہربان یعنی "ثباتِ حیات بے ثبات" اور وہ "نامرادوں کی مراد" "جانِ فانی اجل" کچھ کم نہ تھے۔ پھر وطن اور اہلِ وطن کو ستمگاروں کی فہرست میں شامل کرنا کیا ضرور تھا۔ کہنے کو تو کلیات میں چند ہی شعر ہیں، مگر یہ چند دیوانوں پر بھاری ہیں۔

لو آج مرگِ فانیٔ بیکس سے مٹ گئی
وہ ایک خلش جو خاطرِ اہلِ وطن میں تھی

زمینِ حشر فانی کیا قیامت ہے معاذ اللہ
مجھے اپنے وطن کی سی زمیں معلوم ہوتی ہے

ایک شعر اور ایک مقطع فارسی کا ہے۔

بہ غربتم کہ بہ ہر قریہ ام وطن پیدا ست
بہ ہر زمیں کہ شامم زیرِ آسمانِ من است

این گناہیست کہ عفوم نہ کنندش فانی
کہ من از خاکِ بدایوں، وطنے ساختہ ام

بدایونی ہونے کی حیثیت سے وطن کی طرف سے صفائی پیش کرنا مقصود نہیں ہے۔ اوّل تو انسان کو اتنی وطن پرستی ہی کرنا کیا ضرور ہے کہ حق و ناحق سے قطع نظر ہر جگہ وکالت ہی کی جائے۔ اس کے علاوہ بدایوں اس باب میں کچھ قابلِ شکایت ہے بھی۔ اس لئے فانی کے شکوے کی تلخی اور زہرآبی دیکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ اس فرزند کے ساتھ بھی شاید مادرِ وطن نے سوتیلی ماں کا سا سلوک کیا ہوگا۔ لیکن حالات کی تحقیق کی تو ایک واقعہ بھی ایسا دریافت نہ ہوا کہ ان شکوہ ہائے رنگین کی توجیہہ کر سکتا فانی کے تعلقات، خاندان، برادری اور اہلِ شہر کے ساتھ ایسے نہ تھے کہ شکوہ کا موقعہ ملتا۔ تھوڑی سی حریفانہ چشمک ضرور رہی، کچھ شعراء اور کچھ وکلاء پریشان کن ثابت ہوئے۔ مگر ایسی مخالفتیں جو نہ شدید ہوں نہ مدید زندگی کے دسترخوان پر چٹنی کا کام کرتی ہیں۔ فانی کی خفگی آزردگیٔ بے سبب کے سوا کچھ بھی نہ تھی۔ آخر غالب بھی تو "بیمہریٔ یارانِ وطن" کا شکوہ کیا کرتے تھے اور وہ بھی بے سبب تھا۔ قطع نظر اس سے کہ بدایوں والے فانی کو ہر صحبت میں سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے۔ وہ عزت جو اس نئے زمانے میں کوئی شہر پیش کر سکتا ہے، یعنی بلدی مجلس کی رکنیت فانی کو پیش کی گئی۔ مگر

کہاں فانی اور کہاں مقامی سیاسیات کی متعفن گندگی شاید ہی کسی
جلسے میں شرکت کی ہو۔

قصہ مختصر آج فانی دنیا میں موجود نہیں۔ بدایوں کیا جہانِ
ادب میں ان کی جگہ خالی ہے۔ اور وہ وطن سے کوسوں دور خاکِ
دکن میں اس بسترِ استراحت پر سو رہے ہیں جہاں ہر بے چین کو
چین مل جاتا ہے۔ آج خاکِ بدایوں اگر زبان رکھتی تو سرزمین
آصفیہ سے کہتی۔

اے خاکِ پاک حرمتِ مہماں نگاہ دار
کیں نورِ چشمِ ماست کہ با تو سپردہ ایم

نوٹ۔ یہ مضمون ابتداءً علی گڑھ میگزین کے فانی نمبر میں شائع ہوا تھا۔ جو اب
جنابِ معروف صاحب کے ارشاد پر کچھ ترمیم و تنسیخ کے بعد دوبارہ پیش کیا جاتا ہے

فانی اور اُن کا کلام

پروفیسر عبدالشکور

شاید سنہ ۲۸ء یا سنہ ۲۹ء کی بات ہے، اردو سرکل مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں ایک کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا، اور حضرت احسن مارہروی مرحوم اس بزم کے روح رواں تھے۔ میں نے پہلی مرتبہ فانی مرحوم کو اس موقعہ پر دیکھا تھا۔ اگرچہ معنوی ملاقاتیں ابن علی صاحب کے لحن داؤدی کی معرفت فانی سے اکثر ہوتی رہتی تھیں، شعراء اپنا اپنا کلام سناتے جاتے، اور خراج تحسین حاصل کرتے جاتے تھے۔ آخر فانی تشریف لائے اور انہوں نے اپنا کلام معجز نظام سنانا شروع کیا۔ یونیورسٹی کا تقریباً سب سے بڑا ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایسے مجمع میں معمولی شاعر کے کلام کا سرسبز ہونا کچھ آسان نہ تھا۔ مگر اس سوز و گداز اور معصومانہ وقار کے ساتھ فانی نے پہلا شعر پڑھا کہ سامعین ششدر رہ گئے۔ دو تین اشعار کے بعد تو لوگوں کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ شاعر کے ہر شعر پر ہمیں داد بھی دینا چاہیئے فانی اپنے اشعار پڑھتے جاتے تھے اور مادی دنیا کی ساری روشنیاں گل ہوتی جاتی تھیں، غزل قدرے طولانی تھی، اس کے آخری شعر پر پہنچتے پہنچتے سامعین کو کچھ یہ محسوس ہونے لگا کہ فانی جس دنیا کا ذکر

کر رہے ہیں وہ دنیا اس ہماری دنیا سے مختلف ہے۔ وہ ایسی دنیا
ہے جہاں ویرانی ہے، یاس والم ہے اور اس ویرانی یاس والم میں وہ
وقار، وہ سنجیدگی اور وہ لطافت اور راحت ہے جو اس دنیا میں ترقی
روشنی، سرمایہ کی فراوانی، سائنس کی ایجادات اور صنعت کے
اختراعات کے باوجود نہیں پائی جاتی ہے۔

بعض[۱] ناقدین نے فانی کے کلام کے بارے میں یہ کہا ہے، اور
ٹھیک کہا ہے کہ اس کے کلام میں نہ تحیر پایا جاتا ہے اور نہ تحیر کی سیر دگی
اس کے برخلاف اصغر کے کلام میں تحیر کے نقوش بہت گہرے اور نمایاں
ہیں، مگر میرا خیال ہے کہ ناقدین کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عدم تحیر کسی شاعر
کے کلام کا نقص ہے۔ میرے خیال میں فانی کے کلام میں سب سے زیادہ
نمایاں بات یہی ہے کہ اگرچہ اس کی دنیا تنگ ہے۔ لیکن اس تنگ دنیا
کے چپے چپے سے وہ خوب واقف ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے سوچ سمجھ
کر کہتا ہے۔ اس کے اشعار میں سوز یقین اس قدر مستحکم اور تابندہ
ہے کہ اردو کے اور کسی شاعر میں مشکل سے ملے گا۔ وہ تاریکی میں
نہیں چلایا۔ وہ جو کہتا ہے برملا کہتا ہے اور بے محابا پیش کرتا ہے۔
موت کی حقیقت سے وہ اسی قدر واقف ہے جس قدر حیات کی
حقیقت سے۔ عشق کے اسرار کا اسے جس قدر علم ہے اسی قدر اس
کو حسن کے رموز سے آگاہی ہے۔ یاس والم اور راحت وعشرت کا
کوئی پہلو ایسا نہیں جو اس کی نظروں سے پوشیدہ ہو۔ جبر و قدر کے

---

[۱] ان صفحات کی تیاری میں اپنے ہم کار محمد شمیم صاحب کی مدد کا شکر گذار ہوں۔

مسائل اسے اس قدر ازبر ہیں کہ ان کو دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے۔
پھر لطف یہ کہ اس کے زاویہ نگاہ اور اس کے نظریوں میں کبھی کوئی
تبدیلی پیدا نہیں ہوتی، پہلے دن جو اس نے نعرے بلند کئے وہ آخر وقت
تک اس کی زبان پر جاری رہے۔ وہ ایسے اٹل نظریے لیکر شاعری کے
میدان میں داخل ہوتا ہے گویا ان میں ارتقا کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے
ان اٹل خیالات کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نظریے وجدان
کے ذریعہ فانی تک پہنچے۔ یہ ان کے فکر اور تعمق نظر کی پیداوار نہیں ہیں
آگے چل کر ان کی افتاد طبع اور تجربات زندگی نے ان کی تائید کی،
اور وہ ان کے سرمایۂ یقین کے جزو لاینفک بن گئے۔

فانی جس خاندان کے چشم و چراغ تھے وہ اپنے شہر کا بہت دولتمند
خاندان تھا، زمینداری تھی، جائداد تھی، دولت تھی، وجاہت تھی، اور
وہ سب کچھ تھا جو دنیا دی عشرت و راحت کے لئے ضروری تصور
کیا جاتا ہے۔ لیکن سامان تعیش کی فراوانی فانی کو اپنی جانب ذرا
بھی مائل نہ کر سکی، پھر کچھ عرصہ کے بعد ان کو عسرت اور تنگ دستی
سے دوچار ہونا پڑا۔ اس موقعہ پر ناقدین اس نتیجہ پر اکثر پہنچتے ہیں
کہ فانی بزدلی کا شکار رہے، انھوں نے دنیا کا مقابلہ ہمت سے نہ
کیا۔ کسی قسم کی عملی جد و جہد میں رواں دواں نہ نظر آئے۔ اور
خاندان پر فلاکت و نکبت آنے دی۔ بچوں کو درس و تدریس سے
محروم رکھا۔ خود برباد ہوئے اور اپنے ساتھ اپنے خاندان کو ملیا میٹ

کیا۔ یہ سب تلخ حقائق ہیں، جگر سوز اور جاں گسل حقیقتیں ہیں، مگر ان کو دیکھ کر ہمیں فانی کے کردار کے بارے میں بغیر سوچے سمجھے کوئی حکم نہیں لگا دینا چاہیئے۔ وہ بزدل نہ تھے، صحیح النسب پٹھان تھے ہمت اور شجاعت ان کے کردار کی بڑی حسین خصوصیات تھیں وہ باوقار، اور غیور بھی تھے۔ خوددار، اور بہادر بھی تھے۔ اس لئے اس موقعہ پہ یہ ضروری ہے کہ ہم اس تضاد کو سمجھنے اور اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ یہ تو بہت آسان ہے کہ ہم جوش کیطرح فانی کو بیوۂ والم، اور سوز خوان ازلی کہدیں اور اس کے کل کلام کو ایک تھکا دینے والا، ہمت شکن، اور مبتذل مرثیہ تصور کرلیں لیکن ایسا کرنا در اصل انصاف کا خون کرنا تھا۔ شاعر کی بڑی حق تلفی ہوگی۔ فانی کی قدریں مروجہ قدروں سے بالکل متضاد تھیں، وہ غم کو عشرت، بربادی کو آبادی، درد کو سکون، بے چینی کو چین، موت کو زیست، سمجھتے تھے۔ اور پھر لطف یہ کہ ان قدروں پر ان کا ایمان والیقان اسی قدر گہرا، اور اسی قدر پائدار، اور مستحکم تھا، جس قدر کہ عرف عام میں مومن کا اسلام پہ ہوتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ فانی کے کلام میں اس ایمان والیقان سے کہیں ذراسی لغزش بھی نہیں پائی جاتی۔ عقیدہ کی استواری جو ابتدا میں تھی وہی آخر تک جاری رہی۔ یکساں پائداری اور تابناکی کے ساتھ، گھر کی بنا ڈالنا، اس کو تعمیر کرانا، اور پھر اس میں دلکش ساز و سامان مہیا کرنا ہر شخص کی

فطری خواہش ہے۔ فانی بڑے گہرے جذبہ کے ساتھ اپنے رب کو ادب سے مخاطب کرتے ہیں اور اس سے التجا کرتے ہیں کہ ثواب اتمام کرم کر دے ۔ اور اس گھر کو جو مجھے عطا کیا گیا ہے ویرانی دے، اس ویرانی کے خد و خال دیکھئے اس کے چہرے مہرے پر غور کیجئے، آپ خود اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ یہ ویرانی کس قدر حسین اور کس قدر لطیف ہے۔ ویرانی میں آبادی سے زیادہ حسن پیدا کرنا اور اس کی وحشت کو لطافت اور راحت میں تبدیل کرنا فانی کا فن کارانہ کمال ہے۔ میر بھی اپنی یاسیت کے لئے مشہور ہیں، لیکن ان کے ہاں ویرانی محض ویرانی ہے۔ وحشت تمام و کمال وحشت ہی ہے ۔ فانی کے فلسفے اور تابش ایمان نے اشیاء کی حقیقت تبدیل کر دی ۔ اس حقیقت کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو پھر فانی کے کلام کو مرثیہ سے کوئی مناسبت باقی نہ رہے گی۔ غم والم ہمارے لئے تو غم والم ہیں، جن کا تواتر اور کثرت ہمارے لئے تباہی اور بربادی کا موجب ہوتی ہے، لیکن فانی کے لئے یہ غم والم لذت، راحت اور عشرت کا موجب ہیں ۔ اسی لئے فانی کے کلام میں "لذت غم" کی ترکیب اکثر پائی جاتی ہے ۔ ع

"منع ہے لذتِ غم بھی فانی"

ع ۔ "خراب لذت جانکاہی محبت ہوں"

ع ۔ "دل میسر ہے لذتِ غم کیا"

ع ۔ "کہ غم کو غم سمجھنے سے بھی گھبراتا ہے دم میرا"

سے غم فانی، وعیش برہم کیا جاوداں ہوئے تو عیش ہے غم کیا
اور فانی کے غم کی ہمہ گیری، اور عالم آشوبی کا اندازہ کرنا ہو،
تو یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

غم کو جو خوشی بنا کے چھوڑے
فانی وہ نصیب چاہتا ہوں

غم کو بنا کے محرم اسرار کائنات ہر نقش غم کو پیکر انساں بنا دیا

فانی کا غم اس میں شک نہیں کہ جاوداں تھا، اس غم نے عیش کی صورت اختیار کر لی تھی، اس شاعر کا کلام پڑھنے سے بہت جلد اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی کے ہر شعبہ پر، اس کی حیات کے ہر پہلو پر غم جاوداں طاری وساری تھا۔ اس لئے فانی کا غم اس کے لئے عشرت کا موجب بن گیا تھا۔ اس کی روزمرہ زندگی کا پروگرام بہت مشہور ہے۔

دن رات وہ دیوانۂ خودداری وغیرت
آغوش غم وپہلوئے حرماں میں ملے گا،
وہ نور کا تڑکا ہو کہ ہو تیرگی شام
جب دیکھئے وہ کلبۂ احزاں میں ملے گا،
جب دیکھئے وہ طوق غلامی سے گرانبار
اندوہ معیشت ہی کے زنداں میں ملیگا

ان اشعار کے قافیوں کا غور سے مطالعہ کیجئے پہلوئے حرماں

کلبۂ احزاں، زنداں، شاید یہ ایک ہی شے کے تین مختلف نام ہیں
جس شاعر نے اس طول طویل، ہری بھری دنیا میں سے صرف ایک
تیرۂ و تاریک گوشہ اور ایک کنج اپنے لئے منتخب کرلیا ہو، اور دنیا
کے سارے طول و عرض کو ہوس پیشہ لوگوں کے حوالے کردیا ہو،
اس کے جذبات کی گہرائی، اور شدت کیسی عالم سوز، اور کس قدر
آشوب دہر ہوگی؟۔ فانی اس دنیا کو مکمل فریب جلوہ تصور کرتے
تھے۔ اور بڑی کامیابی اور دشواری کے ساتھ انہوں نے اپنے
دل کو بزم عالم سے اٹھا پایا تھا۔

فریب جلوہ اور کتنا مکمل اے معاذ اللہ
بڑی مشکل سے دل کو بزم عالم سے اٹھا پایا

کیونکہ وہ دنیا، اور دنیا کی مکروہات سے اس قدر دل برداشتہ تھے کہ
اس کی جانب وہ کبھی ملتفت ہی نہ ہوئے۔ ع

"دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے"

اس جنس کے خریدار بن کر وہ کبھی بازار میں نہ آئے، فانی نے
اس دنیا کی آبادی بھی دیکھی، ویرانے بھی دیکھے، لیکن اس عالم کی
نیرنگیوں، اور دلکشیوں سے ہمیشہ دامن کشاں ہی رہے، ان کی
توجہات کا مرکز ایک، اور صرف ایک تھا۔ یعنی ان کے دل کی نرالی
بستی، جو ایسی اجڑی کہ پھر نہ بسی، ان کی روح کی پوری قوت
ان کے افکار و خیالات کی تمام تر رعنائیاں اسی نرالی بستی میں منجمد

ہوگئی تھیں ۔ ان کو اخلاق سے کوئی سروکار نہ تھا ۔ وہ سرمایہ دار اور
مزدور کی جنگ سے بے نیاز تھے، اور وہ سیاست اور فلسفہ سے
ہمیشہ مستغنی پائے گئے ۔ فانی صرف دل کا شاعر تھا ۔ صرف حسن و
عشق کی داستان ان کی شاعری کا تنہا موضوع تھی ۔ اور اسی لئے
ناقدین کا یہ خیال صحیح ہے کہ فانی صرف آرٹ کی محبت میں آرٹ
کا پجاری تھا اسے کبھی یہ گوارا نہ ہوا کہ آرٹ کے ذریعہ وہ اخلاقی یا
سیاسی مبلغ بنے ۔ وہ شاعری کو افادیت میں ملوث کرنا نہ چاہتے تھے ۔

مومن شاعر تھے اور عاشق بھی، غالب بھی عاشق اور شاعر
دونوں تھے ۔ اردو کے شعراء میں شاعری اور عشق (روایتی ہو یا
حقیقی) ہمیشہ ہم عنان پائے جاتے ہیں ۔ اصغر بھی عاشق تھے، اور
حسرت کے دل میں بھی عشق کی شمع فروزاں ہے ۔ فانی کے عشق
کی شدت ان کی شاعری کے کمال سے بہت آگے بڑھ گئی ہے
فرق صرف یہ ہے کہ حسرت ماہر سیاست اور ادیب بھی ہیں اور شاعر و
عاشق بھی ۔ اصغر ایڈیٹر اور مصنف بھی تھے اور شاعر و عاشق بھی،
فانی صرف شاعر و عاشق ہیں اس کے علاوہ کچھ اور نہیں، ویسے وہ
وکیل بھی رہے، مصاحب بھی ہوئے، ہیڈ ماسٹر بھی ہوئے، لیکن یہ
سب مصنوعی اور وقتی ملبوسات تھے جو کچھ دیر کے لئے وہ روزانہ
زیب تن فرما لیتے تھے، اور پھر ٹھیٹ شاعر و عاشق بن جاتے تھے ۔
ان کی شاعری ان کے عشق کی پیداوار تھی ۔ اور اس جذبہ نے ان کے

دل و دماغ اور ان کی پوری شخصیت پر تسلط حاصل کر لیا تھا۔ اپنی سج دھج، اپنے لباس، اپنے کردار، اپنی شخصیت اور اپنے چہرے مہرے کے اعتبار سے فانی سے زیادہ مکمل شاعر اردو شعراء میں مشکل ہی سے کوئی اور پایا جائیگا۔

آیئے! اب ہم فانی کا کلام غور سے پڑھیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ان کے محبوب کے خط و خال کیسے ہیں؟ ان کے حسن کی آن کیسی ہے؟ اور خود فانی کس قسم کے شاعر ہیں، اپنے محبوب سے ان کے تعلقات کیسے ہیں اور کس لہجہ میں وہ اپنے محبوب سے کلام کرتے ہیں۔ یہ سوالات بہت دلچسپ ہیں اور اس میں امید ہے کہ ان سوالات کے جوابات حاصل کرنے میں فانی کی چند خصوصیات شاعری اجاگر ہو جائیں گی۔ فانی ازل سے عشق کا مادہ اپنے دل میں لے کر پیدا ہوئے تھے عشق کی فضا ان کی زندگی پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ سانس لیتے تھے تو ان کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ عشق کی چھری ان کے قلب و جگر میں پیوست ہو رہی ہے ان کے پر درد دل سے جو صدائے عشق آتی تھی اس سے ان کی امید کی آواز تھرا جاتی تھی اور ان کے نالہ ہائے عشق سے زنداں الگ ہل جاتا تھا اور ان کی زنجیر کے حلقے گھبرا گھبرا کر چونک پڑتے تھے۔

فانی کے یہاں عشق کی یہ شدت تو ہے، لیکن ان کا محبوب ناظرین کی نظروں سے ہمیشہ اوجھل رہتا ہے۔ فانی لکھنوی شعراء

کی طرح اپنے محبوب کا سراپا تو کیا دیتے، انہوں نے تو اس قدر پردہ داری
کا اہتمام کیا ہے کہ اپنے محبوب کی لغزش پا، دست سیمیں یا انگشت حنائی
تک کے مشاہدے اور تصور سے ہمیں محروم کر دیا۔ اصغر بھی اپنے محبوب
کی پردہ داری کے بڑے پابند ہیں لیکن حسن کی صاعقہ ریزی اور لغزش
پا کی جھلک ان کے کلام کے دبیز پردوں سے باہر ہی آ جاتی ہے۔ مگر
فانی اپنے محبوب کے حسن کی تابش کو منظر عام پر نہیں لاتے۔ ممکن ہے
کہ انہوں نے عشق مجازی سے عشق حقیقی کی منازل جلد طے کر لی ہوں
یا پھر فانی کی سنجیدگی اور خود نگہداری اس قدر وزنی ہو کہ بے حجابی
کا امکان باقی نہ رہے۔

اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے وجوہ موجود ہیں کہ شاعر نے مذکورہ بالا
منازل بہت جلد طے کیں، شروع ہی سے ان کے ہاں حسن و عشق
میں کوئی فرق نہیں، حسن کی طلعت ریزیاں ان کے نزدیک عشق کی
درد آفرینیاں ہیں۔ اور ان درد آفرینیوں کو وہ حسن کی طلعت
ریزیوں کا مترادف تصور کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ حسن و عشق کا یہ
تصور کوئی شاعر آسانی سے پیدا نہیں کر سکتا۔ اس بلند تصور میں
جان جب ہی پیدا ہو سکتی ہے، جب شاعر کا عشق رچا ہوا اور کھٹرا ہوا
ہو۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

کہتے ہیں حسن ہی کی امانت ہے درد عشق
اب کیا کسی کے عشق کا دعوے کرے کوئی

عشق عشق ہو شاید حسن میں فنا ہو کر
انتہا ہوئی غم کے دل کی ابتدا ہو کر

حیرت عشق کو رکھے کوئی کیونکر تہ عزیز
ترے آئینہ میں تھی، یہ وہی حیرانی ہے

جب شاعر عشق کی اس قدر بلند سطح پر پہنچ جائے کہ حسن و عشق میں کوئی تمیز باقی نہ رہے۔ جب درد عشق کو وہ حسن ہی کی امانت تصور کرنے لگے۔ اور عشق کی آب حسن کے آئینہ میں چمکنے لگے تو پھر اس کے محبوب کا سراپا اس کے کلام میں تلاش کرنا تحصیل حاصل ہے۔ داغ کے شوخ اور چنچل محبوب کے چھاگلوں کی آواز سامعہ نوازی پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ حسرت کا محبوب جب دوپہر کی دھوپ میں کوٹھے پہ دوڑتا ہے تو ہم ہمہ تن اس جانب متوجہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن فانی کے محبوب کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اس کے اور فانی کے درمیان حسن تو کا حجاب ہے۔ اور بار بار بڑی آرزو، اور درد کے ساتھ فانی یہ صدا لگانے پر مجبور ہوتے ہیں۔

"اسی پردے سے دکھا دے رخ زیبا اپنا"

لیکن وہ ایسے خوش نصیب نہیں تھے کہ ان کی التجا قبول کر لی جاتی۔ چنانچہ ان کو نقاب جلوہ کی تماشا ریزی پر قناعت کرنا پڑی اس بلند مقام پر وہی شاعر پہنچ سکتا ہے جو جلوۂ عشق کو حقیقت سمجھے اور حسن مجاز کو اس کا بہانہ، عشق کو اپنی حقیقت، اور حسن کو اپنی صفت تصور

کرے، فانی نے ایک دو مرتبہ اپنے محبوب کے ہونٹوں پر ہنسی اور چشم مسنون گری کی کارفرمائی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور شاید ایک جگہ اپنے محبوب کا سراپا ان الفاظ میں پیش کیا ہے:-

"کتنے فتنے جمع کئے ہیں ان کی ایک جوانی نے
چال قیامت، کافر نظریں، آنکھ شرابی کیا کہیئے"

یہ شاعر کے محبوب کے پیکر خاکی کی تنہا تصویر ہے ایک گونہ بیدلی اور بے کیفی کے ساتھ شاعر نے پیش کی ہے۔ لیکن یہ تعجب خیز ہے کہ طاقت دیدار کا جب مسئلہ درپیش ہوتا ہے اس وقت فانی کی نگاہ شوق گھبرانے لگتی ہے، چنانچہ شاعر اس کے باور کرنے میں تامل کرتا ہے کہ کلیم نے طور پر جلوہ کو بے نقاب دیکھا، بلکہ

"کلیم! برق طور تھی کہ تار تھا نقاب کا"

کیونکہ۔

خود تجلی کو نہیں اذن حضوری فانی،
آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

اور پھر لطف یہ ہے کہ جلوہ اگر خود بے نقاب ہونے کی کوشش کرے تو خود عاشق اپنے چہرے پر نقاب ڈال لیتا ہے۔

دید آخر ہے الٹ دیجئے چہرے سے نقاب
آج مشتاق کے چہرے پہ نقاب آتا ہے

غرض، فانی کے مشرب عشق میں حسن کی عریانی، اور بے حجابہ

بے حجابی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ حسن کی رعنائیوں کا عاشق ہے وہ حسن کی کرشمہ سازیوں کا ازلی پجاری ہے۔ لیکن اس کا حسن ہمیشہ مستور و محجوب رہتا ہے۔ وہ نقاب سے کبھی باہر نہیں آتا۔ وہ سراپا پردوں میں مخفی اور اوجھل رہتا ہے۔ اور یہی دائمی حجاب فانی کے لئے حسن میں حسن اور دلکشی میں دلکشی پیدا کرنے کا موجب ہے۔

یہ شاید ان ہی حجابات کا اثر ہو کہ فانی کا محبوب غرور حسن سے سرشار نظر آتا ہے۔ اس کے دبدبہ اور وقار میں شاہانہ اور خسروانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ اس میں شوخی ہے لیکن

اُن کی شوخی حجاب میں گذری

اس میں خودنمائی ہے۔

حسن بیتاب خودنمائی تھا

اور ان کے غرور کو دیکھ کر فانی کو ادب سے کہنا ہی پڑا۔

کونین پہ بھاری ہے اللہ رے غرور اُن کا
اتنے بھی ادا والے مغرور نہیں ہوتے

یکتائے زمانہ ہونے پہ صاحب یہ غرور خدائی کا
سب کچھ ہو مگر ظالم بد ہن کیا کوئی خدا ہوجاتا ہے

محبوب کا ایک تو یہ رنگ ہے اور دوسرا رنگ ملاحظہ ہو۔

پھر دل سے فانی سارے کے سارے نقش جفا مٹ جاتے ہیں
جس وقت وہ ظالم سامنے آکر جان حیا ہو جاتا ہے،

مشرقی محبوب کی تلون مزاجی مشہور ہے، غور کیجئے کہ فانی کا محبوب کبھی خدا بننے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی جان حیا بن جاتا ہے۔ مگر دونوں صورتوں میں فانی بحیثیت عاشق کے دامن ادب واحترام کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کے عشق میں عجز وانکسار، نیازمندی اور سپردگی کے جذبات فراوانی کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ وہ گلہ بھی کرتے ہیں تو ادب کے ساتھ، وہ شکوہ بھی کرتے ہیں تو بڑی دردمندی وانکساری کے ساتھ، وہ یہاں تک حسن کے وقار کا احترام کرتے ہیں کہ ع

"حسن پشیماں کو فانی میت پہ نہ دے تکلیف کرم"

وہ شکست عشق کی وضع کو نبھانے کی اس لئے کوشش کرتے ہیں کہ ان کے سر بے ادبی کا الزام نہ آنے پائے، خون ناحق کا گلہ کرتے ہیں لیکن ان کے دل میں ادب کا جوش اس درجہ موجود ہوتا ہے کہ ع

"لاش کی صورت زباں تھی اور میں خاموش تھا"

ان کے عشق کی دنیا زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہر پیکر انسانی ان کے لئے عشق کا علمبردار ہے، ان کی نظر میں غم عشق عین نشاط اور راز تخلیق نشاط ہے، محبت انبساط اور تصدیق نشاط ہے، خود فانی پہ عشق کا غلبہ اس قدر قوی ہے کہ ان کی عمر نزع کے عالم میں گذری اور ع

"محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں"

لیکن ان کے عشق میں سادگی، تسلیم و رضا، اور ادب و احترام بشمہ پائے گئے، وہ کبھی چیختے نہیں چلاتے نہیں، نہ کبھی بے ادب ہوتے ہیں اور نہ گستاخ۔ غم نے وہ محبت میں ان کا صبر و شکیب لوٹا، لیکن زیادہ سے زیادہ وہ یہ کرتے ہیں۔ ع

"نگاہِ دلدوز کی دہائی، جمال جاں سوز کی دہائی"

ان کو اپنی بے کسی کا بہت شدید احساس ہے۔ بار بار اس کا اعلان کرتے ہیں اور آغوش رضا میں پناہ لیتے ہیں، وہ اپنی خاطرِ بے قرار اور اپنے دیدۂ اشکبار، اپنے یار کو اور خود اپنی ذات کو اپنا نہیں بلکہ غمِ عشق کا تابع فرمان تصور کرتے ہیں، عشق سے سبک دوشی کو وہ گناہ تصور کرتے ہیں اور صبر کو سرکار محبت میں بے ادبی شمار کرتے ہیں، نشۂ دیوانگی ہوش سے کنارہ کشی چاہتے ہیں، ان کو محبت میں صرف دو کام آتے ہیں۔ ع

"جو رونے سے کبھی فرصت ہوئی، خاموش ہو جانا"

یا

جلے جانا جیسے ممکن ہے یا خاموش ہو جانا

ایسی حالت میں کہ جب فانی کا فشار ضبط قائم نہ رہا، ان کے قبضے سے دل جاتا رہا جو ان کا تنہا غم گسار تھا وہ اپنے محبوب سے یہ التجا کرتے ہیں سہ

آکہ وقت سکون مرگ آیا ‏ نالہ نا خوشگوار تھا نہ رہا

اس کے بعد ان کی حالت غیر ہو جاتی ہے اور وہ وبال ہستی سے سبک دوش ہو جاتے ہیں۔

ان کی بے مہریوں کو کیا معلوم ‏ کوئی امیدوار تھا نہ رہا

مہربان! یہ مزار فانی ہے ‏ آپ کا جاں نثار تھا نہ رہا

اندازہ کیجئے کہ عاشق کی تسلیم و رضا اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ وہ درد فرقت میں تڑپ تڑپ کر جان دیدے اور اپنے عجز و انکسار کو ہاتھ سے جانے نہ دے وہ اپنے محبوب کے گلے شکوے تو کیا کرتے وہ حشر میں دنیا کے گلے شکوے بھی نہ کر سکے کیونکہ ۔ ع

کہنا تو بہت چاہا، کچھ یاد نہیں آیا

حقیقت یہ ہے کہ فانی شکوے کرنے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئے تھے ؎

شکوہ بہ ملا کرتے خیر، یہ تو کیا کرتے

ہاں، مگر جو بن پڑتا شکوہ ایک بار اپنا

وہ شاید ایک بار بھی شکوہ نہ کر سکتے تھے، ان کے ہونے نہ ہونے شکوے کی انتہائی صورت یہ ہے ۔ ع ۔

تم نہ سہی فریادی کے اللہ تو ہے فریادی کا

اگرچہ شکوے کے دھوکے سے بھی فانی احتراز کرتے ہیں ؎

شکوہ سمجھو نہ کم نگاہی کا حال دیکھو مری تباہی کا

شکوۂ غم سے فائدہ شکر ستم بھی کیا ضرور

حسن کے شعبدوں کا حال شعبدہ گر سے کیا کہیں

ویسے توفانی سے

بیگانۂ اختیار ہو جا راضی بہ رضائے یار ہو جا

پر سختی سے عامل تھے، لیکن ان کے عشق کی اداؤں میں ایک بانکپن اور پُروقار انانیت کی جھلک بھی موجود تھی۔ ان کا کاروبار محبت میں خود دار رہنا اور آئینِ عشق کے تقاضوں کو تمام و کمال پورا کرنا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ وہ تہمت نظارۂ جمال اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے صرف نظارہ ساز کے جلوہ کا منہ دیکھنے پر قناعت کرتے ہیں، وہ نہ بیگانۂ عتاب ہیں اور نہ آشنائے لطف صرف گلہ امتیاز کے صورت شناس ہیں۔ اور اس حالت میں اپنے آپ کو شاداں و فرحاں پاتے ہیں، اگرچہ دنیائے عشق رسم خودداری سے واقف نہیں ہوتی لیکن۔ ع۔

پھر بھی اپنا زخم دل شرمندۂ مرہم نہ تھا

خودداری نے فانی کی ہمت بڑھائی اور وہ یہ کہنے پر مائل ہوئے سے

عرش کی منزل بھی تھی کیا بارگاہ قلب دوست؟

کیا اب اتنا بھی اس آہِ نارسا میں دم نہ تھا

فانی کی ہمت دعا کی بھی مرہون منت نہیں ہونا چاہتی۔ وہ دعا کو گدائے اثر سمجھتے ہیں۔ اور اس گدا پر تکیہ کرنا اپنی توہین تصور کرتے ہیں۔ ان کو اعتماد اثر کی بھی تلاش نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی حیات مدعائے حیات سے محروم ہے۔ وہ خضر کی تلاش توروایتاً کرتے ہیں۔ مگر خضر سے روشناس نہیں ہوتے اس لئے نہ ان کو رہنما ملتا ہے اور نہ رہ گذر میں نقش پا نظر آتا ہے۔ وہ خود برق بننے اور طور تجلّی سے گذرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، خود شعلہ بننے اور وادی سینا سے گذرنے کا خواب دیکھتے ہیں۔ وہ بے واسطۂ خود نگری اپنی طرف دیکھنے، آئینہ اٹھانے اور حسن خود آرا سے گذر جانے کا مشورہ دیتے ہیں اور آگے ذرا اور بلند ہو کر پکارتے ہیں ؎

اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظّارہ کہاں تک
اس مرحلہ سعی تماشا سے گذر جا

اور چاہتے ہیں کہ ؏

"ہر کلمۃ الحق میں اک کیف انا بھر دوں"

جس کے بعد ان میں اس قدر خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے کہ ؎

جس طرف دیکھ لیا پھونک دیا طور مجاز
یہ ترے دیکھنے والے وہ نظر رکھتے ہیں

اور دل کو پھر یہ باوقار درس دینے لگتے ہیں۔

کشتی کا سہارا ہی تو گرداب ہے فانی

دریا ہی میں تو ڈوب گئے، دریا سے گذر جا

ناکام ہے تو کیا ہے کچھ کام پھر بھی کر جا

مردانہ وار جی، اور مردانہ وار مر جا

یہ تو فانی کی داستان عشق کا باوقار اور پر تمکنت پہلو ہے اور بڑی حد تک دلچسپ ہے لیکن ان کی داستان عشق کے اور پہلو بھی بہت دلچسپ ہیں اور ان میں بھی فانی کی پر عظمت شخصیت کی جھلک جا بجا پائی جاتی ہے

ان کی غزل "شاد نہ کر، برباد نہ کر" بہت مشہور ہے۔ اس کی ردیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے معاملات عشق میں خود فانی کیا نہ کرنا چاہتے تھے۔ اور محبوب سے کیا نہ کرنے کی فرمائش کرنے پر مائل تھے۔ ان اشعار سے ان کی عشقیہ زندگی کی بہت دل نشیں تشریح ہو سکتی ہے۔ وہ مطلع ہی میں اعلان کرتے ہیں کہ ان کا دل مایوس ناز پرور، وہ عہد کرم ہے لسے شاد نہ کرنا چاہئیے پھر خود سے پناہ مانگتے ہیں اور اسے جتلاتے ہیں۔

میں ہوں دنیائے محبت مجھے برباد نہ کر

اس کے بعد ہی کے شعروں میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ فانی کے دل میں اپنے محبوب کا کس قدر احترام تھا، محبوب کی پشیمانی

کے خیال سے ان کی روح لرزنے لگتی ہے اس لئے اس سے وہ التجا کرتے ہیں کہ تو اپنی جفا کو یاد نہ کر، وہ اس کی بھی اجازت نہیں دیتے کہ ان کی خامشی فغاں کی صورت اختیار کرلے کیونکہ ان کے آداب محبت اس کو برداشت نہیں کر سکتے کہ آہ و فغاں کسی عنوان سے بھی کی جائے، ان کے خیال میں بہتر تو یہ ہے کہ اگر بن پڑے تو عاشق صبر کرے، شکوۂ بیداد تو ہر حالت میں آئین عشق کے منافی ہے۔

فانی کو اپنے محبوب کی دلداری کا بڑا پاس و لحاظ ہے۔ حسن کی نازک مزاجی سے وہ ناواقف نہیں ہیں۔ فانی کے محبوب کی نزاکت طبع اور شوخی ملاحظہ ہو۔

اللہ رے تیرے دل کی نزاکت کا تقاضا
تاثیر محبت سے بھی ہم کام نہ لیتے
پڑتی ہیں ابھی دل پہ شرماتی ہوئی نظریں
جو وار وہ کرتے ہیں بھرپور نہیں کرتے

فانی حسن کے رموز کے راز دار ہیں، فسوں گر کی آنکھوں کے اشارے سے ان کا دل درد محبت کا سہارا حاصل کرتا ہے کافر کے نقش کف پا کا سحر ان کا سر جھکا دیتا ہے اور وہ سجدہ ریز ہوتے ہیں، نگہ شرمسار میں فانی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ روز ازل میں جتنی شوخیاں قسمت میں تھیں سب یک جا کر دی گئی ہیں۔ یہ سب

کچھ ہے اور خود فانی کے لئے حد سے زیادہ نامرادی، اور مایوسی ہے۔ لیکن ان کے ادب، ان کی سپردگی اور نیازمندی میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی، ان کا محبوب اگر ان سے خفا ہو جاتا ہے تو وہ محبوب سے تو کچھ تعرض نہیں کرتے مگر جینے سے خفا ہو جاتے ہیں۔ ان کے محبوب کو اگر ان کا اعتبار جاتا رہتا ہے تو ان کو اپنے آپ سے بے اعتباری پیدا ہو جاتی ہے، نامرادیوں اور مایوسیوں کے باوجود کافر بے مہر کے در پہ ان کی ناصیہ فرسائی کا شوق ان کو کشاں کشاں پہنچا دیتا ہے اور وہ یہی کہتے ہیں۔

آپ سے شرح آرزو تو کریں آپ تکلیفِ گفتگو تو کریں

کاش آئینہ ہاتھ سے رکھ کر
تم مرے حال پر نظر کرتے

ارباب محبت پر تم ظلم کے بانی ہو یہ ورنہ محبت کے دستور نہیں ہوتے

کچھ بس ہی نہ تھا ورنہ یہ الزام نہ لیتے
ہم تجھ سے چھپا کر بھی ترا نام نہ لیتے
کیا عمر میں اک آہ بھی بخشی نہیں جاتی
اک سانس بھی کیا آپ کے ناکام نہ لیتے
تیری ہی رضا اور تھی، ورنہ ترے بسمل
تلوار کے سائے میں بھی آرام نہ لیتے

حیاتِ فانی میں حسن و عشق کی جو ازلی اور دائمی کشمکش تھی، اس کا اندازہ اس غزل سے ہو سکتا ہے۔

ہر گھڑی انقلاب میں گذری — زندگی کس عذاب میں گذری
شوق تھا مانعِ تجلی دوست — ان کی شوخی حجاب میں گذری
کرم بے حساب چاہا تھا — ستم بے حساب میں گذری
ورنہ دشوار تھا سکونِ حیات — خیر سے اضطراب میں گذری
کچھ کٹی ہمت سوال میں عمر — کچھ امید جواب میں گذری

کس خرابی سے زندگی فانی
اس جہانِ خراب میں گذری

یہ تو ان کی حیاتِ عشق کا مستقل پروگرام تھا جو مدتوں جاری رہا، لیکن زندگی کے آخری دور میں فانی اپنے صحیح جذبۂ عشق کے ذریعہ بارگہہِ حسن میں بہت بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ان کا جذبۂ محبت صرف مطلب کی الجھنوں سے پاک ہوگیا تھا۔ ان کا عشق صادق مدعا کی آلائش سے منزہ ہوچکا تھا۔ وہ صرف عشق کرنے کے لئے عشق کرتے تھے اور یہ اس لئے کہ شاید ان کی تخلیق کا مدعا یہی تھا۔ انہوں نے عشق میں پاکیزگی اور طہارت ہوتی اور غم کو اس قدر بلند کیا اور اس کو اس قدر روحانی نکھار عطا فرمایا کہ راحت و عشرت غم کے مقابلے میں حقیر اور بے رنگ معلوم ہونے لگی۔ یہ روحانی عظمت صرف اسی کو حاصل ہو سکتی ہے

جس کا مسلک یہ ہو۔ ع

دل کی جو حقیقت ہے کیا کہیئے حسن بھی دل ہے عشق بھی دل

وصل ہو یا ہجر دونوں ہیں مرے مشرب میں کفر

شوقِ وحدت آشنا بیگانہ آغوش ہے

نگاہ ناز و سوز عشق دونوں ایک ہیں لیکن

کہیں ہوتی ہے یہ بجلی کہیں معلوم ہوتی ہے

اور جو جذب کی حالت میں یہ پکار اٹھے ؎

حیرت نے مجھے ترا آئینہ بنایا ہے

اب تو مجھے دیکھا کرا ے جلوۂ جانانہ

یہ صرف فانی کے روحانی عشق کا تصرف ہے کہ وہ جلوۂ جانانہ کو دعوت نظارہ دیتا ہے۔ ایک تو یہ مقام ہے جہاں وہ شوق وحدت آشنا کو بیگانہ آغوش تصور کرتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ۔ ع

تھا جو کچھ تیرے سوا آغوش ہی آغوش تھا

اسی کو حسن و عشق کا اتصال کہتے ہیں۔ اردو کے بہت کم ایسے شعراء ہیں جو روحانیت کے ذریعے اس بلندی پر پہنچے ہوں۔ فانی کے دل کی گہرائیاں نورِ عشق سے معمور تھیں۔ چنانچہ ان کی زندگی کا ساری عمر عشق میں کوئی ساماں بھی بہم نہ ہوا اور آخر دم تک یہی کہتے رہے

مجموعۂ آداب دو عالم ہے محبت

مرنے کے سلیقے ہیں نہ جینے کے قرینے

اوران کے حیات عشق کے آخری دور کی تصویر یہ ہے ؎

منزل عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

آپ نے فانی کا فلسفۂ عشق دیکھا، لیکن فانی کے محبوب کا سراپا پس پردہ ہے، اس کے حجاب کا تو یہ عالم ہے کہ چھپ چھپ کے دیکھتا ہے کہ کوئی دیکھتا نہ ہو۔ مگر اس کی ادائیں اس کے حسن کی غماز ہیں۔ فانی کی داستان عشق سننے کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ فانی کے محبوب کا سلوک فانی کے ساتھ کیا ہے؟

فانی کا محبوب اردو کے روایتی معشوق کی طرح ستم ایجاد ہے اور رقیب نواز، اسے عشوہ طرازی کے سارے گُن معلوم ہیں وہ میر کے محبوب کی طرح آفت دل عاشقاں ہے۔ وہ شوخ بھی ہے اور ستم گار بھی۔ اسے لگاوٹ کی باتیں خوب آتی ہیں، مگر یہ اس کا اپنا مخصوص کردار ہے، اس کی نگاہ لطف بیشتر دشمن ہی کی طرف رہتی ہے۔ اس لئے فانی نے اسے ستم ناآشنا دیکھا ہے، کرم ناآشنا پایا ہے۔ اس کی نگاہ نگاہِ بے نیازانہ ہے اس کی وضع وضع خود پسندی، لیکن اس کی بیداد میں بیداد کے انداز نہیں ہیں وہ مائل بہ کرم ہوتا ہے مگر یوں کہ اس کی کسی ادا پہ جفا کا گماں نہیں

ادا سے آڑ میں خنجر کی منہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے

اس کو رحم آتا ہے مگر عاشق کے جنازہ پر اس کی دلبری کا عالم دیکھئے۔

ہائے ان کا مری میت پہ یہ عذر تاخیر
سو گئے تم مرے دامن کی ہوا سے پہلے

ع۔ کچھ نہ کہنا وہ کسی مجبور خموشی کا ہائے
ع۔ وہ ترا جنازہ پہ کہنا خفا کیوں ہو گئے

اس کی بیداد کے انداز نرالے ہیں،

ان کے آگے جب یہ آنکھیں ڈبڈبا کر رہ گئیں
وہ حیا پرور نگاہیں مسکرا کر رہ گئیں
بیداد کے اس تیور اس حسن کے ہیں صدقے
ان کو مرے مرنے پہ آئی تو ہنسی آئی،
مسکرائے وہ حال دل سن کر اور گویا جواب تھا ہی نہیں

حسرت کے یہاں تو ارباب حسن کو بھی تمنائے عشق ہو جاتی ہے، حسن مائل کرم ہوتا ہے، مدت کے بعد ہی سہی، جذب دل بیکار تو نہیں جاتا۔

پھر آج وہ برسر کرم ہیں از راہ کمال مہربانی
آج سن کر مرے نالوں کو نہ رہا التفات
زیر لب اس نے بھی کھینچی اک آہ التفات

فراق کے یہاں ہیں سوز ہجر سے زیادہ لذت وصال ملتی ہے

جگر اور اصغر کے یہاں ہیں ستم بے حساب کے ساتھ کرم گاہ گاہ بھی ملتا ہے۔ لیکن فانی کے گلشن آرزو میں بہار کامرانی کم آتی ہے۔ کاروبار عشق میں فانی کے لئے یہ موقع کبھی نہیں آیا ؎

آہ وہ رات کہ اس رات کو باوصف حجاب
سر حسرت کے لئے وقف تھا زانو تیرا

ان کی نامرادیوں کا عالم ہی دوسرا ہے ؎

دل کو یاد نشاط وصل نہ چھیڑ
غم میں گذری ہے غم میں گذریگی

ان کا محبوب کہ جس کے پاس سوال وصل پہ "نہیں" کے سوا کوئی جواب نہیں، لحد پہ آتا ہے تو تیوریوں میں شکوہ بے جا لئے ہوئے، وہ عاشق کشتہ پہ آسودہ قرار ہونے کی تہمت رکھتا ہے۔ اور لبصد عشوہ و ادامیت سے مسکرا کر رخصت ہوتا ہے، بدگمانی کا یہ عالم کہ مرگ عاشق کی خبر سن کر خفا ہوجاتا ہے، اس کے ستم ہائے نمایاں، کہ بعنوان دلستانی کرتا ہے، بڑے دلکش ہیں

ہیں ندامت جان کر خوش ہوں یہ منظر دیکھنا
وہ مجھے تڑپا کے تیرا پھر نہ مڑ کر دیکھنا
ماسوائے دل میں اک ہنگامہ برپا کر گیا،
چشم کافر کا وہ دل لے کے مکر کر دیکھنا

ع ۔ قبر پہ فانی وہ آکر بے مروت لکھ گئے

اردو کی عشقیہ شاعری کے مطالعہ میں محبوب کے کردار کی نسوانیت بڑی غور طلب چیز ہے۔ فانی کی شاعری ہمیں مشرقی محبوب کی مخصوص نسوانی اداؤں کا جلوہ دکھاتی ہیں۔

نہ بن پڑا کوئی عذر جفا کسی سے تو ہائے
ادا وہ یاد ہے گھبرا کے روٹھ جانے کی

اچھا حجاب ہے کہ جب آتے ہیں خواب میں
پھر پھر کے دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

محبوب کی یہ نسوانیت حسرت کے یہاں آکر زیادہ بھرپور، رنگین اور شوخ ہو جاتی ہے۔

حسرت کے یہاں جسم و جمال محبوب کی جو تصویریں ہمیں ملتی ہیں۔ ان میں حرارت بھی ہے اور حرکت بھی، فانی کے محبوب کی تصور اور تصویر میں اس گرمئ نشاط کی بڑی واضح کمی ہے۔ اس کی ایک وجہ ان کی حجاب پسندی ہے دوسری ان کی غم پسند طبیعت۔

فانی کے کلام میں سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ ان کا غم بڑی حد تک انفرادی ہے، ان کی شاعری صرف حیات فانی کا نوحہ ہے اس نوحہ کی لے میں کائنات کے غم کی کسک نہیں ہے۔ ان کے لہجہ میں نہ میر کی سی گھلاوٹ ہے نہ فراق کی سی لچک، ان کے خیال میں نہ میر کی آفاقیت ہے نہ فراق کی حیات آفرینی، ان کے غم میں نہ قلاقی ہے نہ جان بخشی، ان کے غم میں فریاد زیادہ ہے عرفان کم

ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں شعورِ غم ملتا ہے۔ لیکن سرد رغم نہیں، ان کے سیہ خانہ میں مسرت کی کرن کا گذر نہیں ہے، ان کی تصویر کا ایک ہی رخ ہے اور اس کا رنگ سیاہ ہے، انہوں نے موت کو اپنا نجات دہندہ تسلیم کیا ہے، ان کا سوزِ عشق ان کو خواہش مرگ کی طرف لیجاتا ہے وہ اپنی محبوب مرگ حیات آفریں سے ایک نوع کا سمجھوتہ بھی کر لیتے ہیں مگر اس سوزِ عشق میں سوزِ حیات کی لَو دھیمی پڑ جاتی ہے۔ ان کا عشق فانوسِ جہاں نہیں ہوتا۔ وہ خود کو ہجر میں تنہا ہی سمجھتے ہیں ؎

اک عمر پرستارِ شبِ ہجر رہا تھا
اے زُلفِ سیاہ ماتمِ فانیؔ میں بکھر جا

وہ روایتی جفائے محبوب میں یقیں رکھتے ہیں، انہوں نے شمع کو ہر رنگ میں جلتے نہیں دیکھا ہے ؎

اس کی جفا پیامِ غمِ جاوداں نہیں
اے عشق نا امید کبھی شادماں بھی ہو (فراقؔ)

فراق کی یہ امید افزاوری ہمیں داستان فانیؔ میں کم نظر آتی ہے فانیؔ کے سوزِ عشق نے صرف اپنی ذات کو اپنا مرکزِ توجہ بنالیا ان کا غمِ عشق غمِ عالم سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ ان کی شاعری میں کائنات کے حسن کا وہ لطیف ادراک نہیں ملتا جو آزردہ دلوں کی مسلسل کاوشِ غم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ غمِ عاشق کی معراج

یہی تو ہے کہ وہ غم انسان بن جائے، یہ وہ مقام محمود ہے جہاں
شاعر کا لہجہ آفاقی ہو جاتا ہے۔ اس عالم خیال میں وہ جو کچھ کہتا ہے
اس میں زندگی کا جلال و جمال، سوز و ساز، غم و راحت، شورش و
سکون، سب ہی کچھ ہوتا ہے۔ وہ حیات سے بھی کام لیتا ہے،
اجل سے بھی، وہ دل کے دکھنے پر مسکرا بھی سکتا ہے، پرسش
کرم پہ اس کی آنکھوں سے آنسو بھی نکل سکتے ہیں۔ فانی کی تیغ
محبت زہر غم میں بجھی رہی مگر وہ اس جہان خراب کو آب حیات
نہ دے سکی، ان کے سوز محبت کی آنچ دہکتی رہی مگر سوز کائنات
کی کیمیا نہ بن سکی، فانی کی یہ ناکامی ان پر الزام نہیں ہے اور نہ ان
کی شاعری کی مخصوص اہمیت کو کم کرتی ہے، انہوں نے دنیا کو
اپنی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ان کے تخیل کی حدیں ساری کائنات
پر محیط نہیں ہیں، ان کا دائرہ خیال محدود ہے۔ نقاد کی خواہش
ان کے کلام میں حیات و کائنات کے گوناگوں تجربات و احساسات
نہیں پیدا کر سکتی، فانی کی زندگی عشق ہے، اور راہ عاشقی میں اس کا
ایک ہی تجربہ ہے، وہ تجربہ غم ہے، فانی کی شاعری اس تلخ تجربہ کا ایک
انکشاف ہے۔ ان معنوں میں فانی کے جذبات متعدد بہت کم
ہیں۔ ان کی شاعری ان کی زندگی ہے، وہ خالص داخلی شاعر ہیں
ان کی افتاد طبع اذیت کوش اور ان کا ہر پیکر خیال سیہ پوش ہے
فانی کے اس تاریک سیارہ پہ غم عشق کی قدریں عجیب تباہ کن

اندازمیں بدل جاتی ہیں -

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی
گرداب کی ہر تہ میں ساحل نظر آتا ہے

فانی وہ بلاکش ہوں غم بھی مجھے راحت ہے
میں نے غمِ راحت کی صورت بھی نہ پہچانی

اجل کی آرزو ہو دل میں فانی اور دنیا ہو
خدا رکھے یہی رونق ہے اس اُجڑے ہوئے گھر کی

اُمیدِ مرگ ہے جاتی تو نا اُمید نہیں
کہ اپنی وضع کے اُمیدوار ہم بھی ہیں،

آگئی تیرے بیمار کے منہ پہ رونق
جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارمان نکلا

وہ دل اذیت آفریں، اور مذاقِ تلخ پسندی کے شیدائی ہیں وہ ایذا کے ساتھ لذتِ ایذا بھی تلاش کرتے ہیں، وہ غم کدۂ روزگار میں ایسا درد ہیں جو دلِ نوازیٔ درماں کی تاب نہیں لاسکتا ۔

✓ دل کو یادِ نشاطِ وصل نہ چھیڑ
غم میں گذری ہے غم میں گذرے گی

اس آشوبِ دہر کا کیا کہنا جو دیکھے ہوئے دل کو عیشِ دوعالم کہے، مرگِ ناگہانی کو عیشِ مرگِ ناگہانی لیے دل کو جانِ تمنا، آمدِ غم کو نویدِ شادی، المِ جاں گداز کو احسان، قضا کو دلہن، زخم کو

نصیب جگر، خلعت مختاری کو مجبوری عریاں، انسان کو غم مجسم، زمین حشر کو سرزمین وطن، اس کی اپنا پسندی کا بھلا کیا ٹھکانا جیسے نہ جینے کی امید ہو نہ مرنے کا یقین، جیسے یہ غم ہو کہ غم جاوداں نہیں ملتا جیسے زندگی الزام معلوم ہوتی ہو، جو ہر نفس کو عمر گذشتہ کی میت کہتا ہو، جو آرزوئے مرگ پر لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰہ کہتا ہو، فانی کو اپنے اس نوحۂ ہستی سے فرصت ہی نہیں ملتی، اور اگر اس نے کائنات کی جانب کبھی نگاہ بھی کی تو اسی سیاہ چشمہ سے ؎

کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں
اک بے قرار تڑپا، اک دل فگار رو دیا

۶-۹ فانی کا فلسفۂ حسن و عشق اپنے دائرے میں محدود سہی لیکن وہ بہت CONSISTENT ہے، ان کے عشق کا ایک کردار ہے، انہوں نے غم عشق کے لئے جو اقدار متعین کر لی ہیں وہ بہت حیرت انگیز طور پر یکساں ہیں، وہ غیر مربوط اور منتشر نہیں ہیں، ان میں تسلسل ہے اور منطقی تدریج بھی، اگر کبھی ان میں تبدیلی بھی ہوتی ہے تو رفتہ رفتہ، یہ بات غور کے لائق ہے کہ یہ تبدیلی ہمیشہ فطرت انسانی سے وابستہ رہتی ہے اور کبھی ممکنات کا دامن نہیں چھوڑتی، فانی تلاش محبوب سے مایوس ہو کر تمنائے مرگ تک پہنچتے ہیں، لیکن موت کا انتظار قیامت کا انتظار ہوتا ہے، محبوب اور موت کی آمد فرق نہیں رہتا، انہیں موت کی ستم گاری پر پیار آنے لگتا۔

وہ موت ہی کو محبوب بنا لیتے ہیں، اسی کو حیات اور مدعائے حیات سمجھنے لگتے ہیں، لیکن ان کے ذہن پر ایک بار پھر تشکیک کے بادل چھا جاتے ہیں اور وہ سوچنے لگتے ہیں، کیا یہ پیماں شکن محبوب ان کا ساتھ دے سکے گا؟ کیا موت کی تمنا کبھی سازگار ہو سکے گی؟ شاید "وصال" ان کی تقدیر نہ تھی، موت پر ان کا ایمان و ایقان شک سے بدل جاتا ہے۔

یہ دردِ محبت غمِ دنیا تو نہیں ہے
اب موت بھی جینے کا سہارا نہ رہے گی

لیکن یہ تو بہت بعد کی بات ہے، یہی وہ مقام ہے جس کے لئے فانی نے کہا تھا:۔

ہیں منزلِ فنا کا نشانِ شکستہ ہوں

فانی بدایونی

از حضرت فراق گورکھپوری - ایم - اے، پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی

بات ہے سنہ ۱۹۲۰ء کے قریب کی - میں آگرہ جیل میں سیاسی قیدی تھا - ڈیڑھ دو سو سیاسی قیدی تھے - انھیں اسیران فرنگ میں کسی کے پاس علی گڈھ میگزین کا کوئی نمبر تھا، قید میں لٹریچر کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے، خواہ وہ کسی میگزین یا اخبار ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو، کسی کو جیل میں میگزین کیا ملی بھگوان سے ملے۔ خدا قدیم سہی، میگزین بھی پرانی سہی، لیکن قید میں جیل کے باہر کی ہر چیز نئی نظر آتی ہے - وہ میگزین میرے ہاتھ لگی اور اس میں پہلے پہل فانی کی یہ غزل میں نے دیکھی ؎

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

میری عمر اس وقت تیئیس برس کی تھی - غزل سے اتنا متاثر ہوا کہ دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ فانی کوئی بہت بڑا شاعر ہے، اس وقت تک فانی کی بڑھتی ہوئی شہرت کی بھنک کانوں کان خبر نہ تھی کچھ دنوں کے بعد نیاز فتحپوری کے ہاتھوں نگار کا پہلا نمبر نکل کر جیل میں آیا - اس میں فانی کی دوسری غزل دیکھی اور پھر تیسری

غزل دوسرے نمبر میں دیکھی ؎

تجھے خبر ہے ترے تیرِ بے پناہ کی خیر
بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا[1]

فانی کفِ قاتل میں شمشیر نظر آئی
لے خوابِ محبت کی تعبیر نظر آئی

یہ تھیں فانی سے مری پہلی ملاقاتیں؛ جسمانی ملاقاتیں اُن سے کبھی نہ ہوسکیں، بعد کو تو باقیاتِ فانی اور پھر عرفانیاتِ فانی نے میری فانی سے نہ جانے کتنی روحانی ملاقاتیں کرائیں۔ فانی کی تصویر بھی دیکھی اور وہ نشتر کی طرح تب سے اب تک میرے اندر ڈوبتی ہی جارہی ہے اور ڈوبتی ہی جائے گی۔ شاید ہی کسی شاعر کی تصویر میں اتنی نشتریت ہو۔ ہاں تو اگرچہ بعد کو فانی کی شاعری یا ان کی روح اپنے پورے فروغ کے ساتھ نکھر نکھر اتھرا کے فضا کو مرتعش و منوّر کرتی رہی، لیکن جوانی میں اور جیل میں جس پہلی ملاقات کا ذکر کرچکا ہوں اس کا چٹیلا پن کچھ ایسا تھا اس کی نشتریت میں کچھ ایسی تازگی تھی کہ مجھے یہ سوچ کر دریدہ رشک ہونے لگا کہ اس وقت فانی جیسے تھے اس سے زیادہ کیوں مشہور

---

[1] اس پر نیاز فتحپوری کا نوٹ تھا: "مومن کا شعر بے اختیار یاد آیا ؎

اِک تیر کی واں ترکشِ قاتل میں کمی ہے — یاں سینے میں اپنا دلِ مضطر نہیں ملتا

ہوئے، کسی شاعر کی عالمگیر شہرت اس کے اثرات سے وہ اپناپن چھین لیتی ہے۔ جو طلوعِ شہرت کے وقت لوگ محسوس کرتے ہیں۔ شاعر کی پہلی شہرت اس کے بعد کی شہرت کی رقیب بن جاتی ہے اور شاعر کی مکمل، مجموعی اور مستقل شہرت کے متعلق ہی یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ اس کی ہر نظم ہر غزل کے بارے میں صحیح ہے۔ فانی کی غزلوں کو پہلے پہل رسالوں میں دیکھ کر جو اچانک پن چونکا دینے والی بات ملتی تھی بعد کو دیوان میں انھیں غزلوں کو دیکھ کر وہ حیرت، وہ خلش اور چبھن رشک کی صورت اختیار کر لیتی تھی "دیوان میں یہ غزل کیوں ہے" - یہ طفلانہ اعتراض دل میں اٹھنے لگتا ہے، کم سے کم میرے دل میں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی شاعر کا کلام جستہ جستہ سننے یا دیکھنے کو ملے تو یہ شاعرانہ بات ہوتی اور پھر وہی کلام اس شاعر کے مجموعہ کلام کی شکل میں ہاتھ آئے تو یہ کچھ غیر شاعرانہ بات ہوئی۔ گویا شاعر سے وجدانی ملاقات کی تازگی، نرالاپن اور نوعیت مجموعہ کلام بن کر میکانکی (Mechanical) چیزیں ہو گئیں۔

میں سنہ ۱۹۱۴ء سے اب تک بہت کچھ بن بگڑ چکا ہوں اور شاید بدل بھی چکا ہوں۔ شہید شعر ہے شہید شاعری یا مجروح شاعری تو ہو ہی چکا ہوں اور یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ شاعر ہونے کی بہت مہنگی قیمت بھی دینی پڑتی ہے، خون جگر کھانے کے معنوں میں نہیں بلکہ ان معنوں میں کہ وہ باقی شخصیت متعین اور محدود

سی ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے کلام سے شاعر بہ مقابلہ دوسرے پڑھنے والوں کے بہ یک وقت زیادہ اور کم متاثر ہو پاتا ہے۔ میرا بھی کچھ ایسا ہی حال ہوا، شاعری میں میرا رنگ طبیعت جیسے جیسے نکھرتا گیا اس میں ایک انفرادیت آتی گئی، اپنی پہلی بھولی بھالی سپردگی میں کھو بیٹھا۔

فانی کے شعر اب بھی نشتر کی طرح میرے دل میں اتر جاتے تھے۔ لیکن میری بھی ایک وجدانیت بن چکی تھی۔ اس لئے "ایک خلش ہوتی ہے محسوس رگ جاں کے قریب" والی بات تو اب بھی فانی کے کلام سے ہوتی تھی۔ ضرور ہوتی تھی۔ اور ہوتی ہے۔ پھر بھی اس قریب میں بعید ہونے کا بھی احساس ہونے لگا۔ میں بھی دکھی آدمی ہوں لیکن میرا دل اس عنوان و انداز سے نہیں دکھتا جس عنوان و انداز سے فانی کا دل دکھتا ہے۔ غالب نے کیوں کہا: "فریاد کی کوئی لے نہیں ہے" غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ نالہ بھی "پابند لے" ہے۔ اپنا اپنا رونا اپنا اپنا ہنسنا۔

فانی کا دل بہت دکھا ہوا ہے۔ شاید پوری اردو غزل گوئی کی تاریخ میں بھی اتنے دکھے ہوئے دل اور اتنی دکھی ہوئی آواز کی ایسی گنی ہی مثالیں مل سکیں گی، ان کی حقیقی زندگی کے تجربوں نے ان کے دکھ اور غم کو جنم دیا اور پالا، ان تجربوں اور محسوسات نے ان کے لئے حیات و کائنات کی پوری فضا کو رنگ ڈالا تھا۔ ان

کی جنسی، شہوانی یا روحانی ناکامیاں (Frustrations)
ان کا فلسفۂ زندگی ان کا نقدِ حیات ہو کر رہ گئیں۔ فانی میں شرافت
و بذلہ سنجی اتنی تھی کہ ان کی باتیں اور ان کی شخصیت من کو موہ لیتی
ہیں اور جی کو لبھا لیتی ہیں، ان کے آنسوؤں میں نشتر کی طرح موج
ہائے تبسم تھرتھراتی، ڈوبتی اور اچھلتی ہیں۔ نہ وہ گم سم آدمی تھے
نہ ٹھس آدمی تھے نہ چڑچڑے آدمی تھے۔ یہ شرافت، نیکی، معصومیت
یہ تہذیب اور لطافت، یہ نرمی اور بھولاپن، سب کے حصے میں نہیں
آتے۔ شاید ہی کوئی اردو غزل گو ساٹھ برس کی عمر تک اس بال
سبھاؤ (بچوں کی طبیعت) کا ثبوت دے سکے۔ یہ کہنا مشکل ہے
کہ یہ نرمی ان کے مزاج میں ضبطِ غم کی وجہ سے آئی تھی۔ یا یہ
ضبط ان کے مزاج کی نرمی کی وجہ سے ان میں آگیا تھا۔ سب
کچھ دیکھتے سنتے ہوئے سب کچھ سہتے ہوتے یہ شخص کتنا بھولا،
بھالا تھا۔ میر کا شعر ہے ؎

آتے ہیں میر منہ کو بنائے خفا سے آج
شاید بگڑ گئی ہے کچھ اس بے وفا سے آج

فانی کبھی "منہ کو بنائے خفا سے" نظر نہیں آتے۔ ان پہ
سب کچھ بیت چکی ہے۔ لیکن کسی بیوفا سے "شاید بگڑ گئی ہے"۔
یہ ان کے معاملاتِ حسن و عشق کی صحیح رپورٹ نہ ہوگی۔ فانی ہنس
مکھ عاشق نہیں تھے لیکن انھیں منہ بنانا اور "خفا سے" نظر آنا بھی نہیں

آتا تھا۔ انھوں نے غم اور قنوطیت کو ایک نیا مزاج دیا ایک نیا لہجہ دیا
انھوں نے غم کو ایک نئی چمکار دی، اُسے بہت نرم اور سجک دار
انگلیوں سے رچایا اور نکھارا، اسے نئی لوریاں سنائیں۔ اسے
اپنی آواز کے ایک خاص لوچ سے سلایا اور جگایا۔ زندگی غم کو
فانی نے نئے ادب (Etiquette) سے سنوارا، اور نئے
تکلفات سے نکھارا، غم کے اندر نئی روک تھام نئی تھرتھری پیدا
کی، نئی چٹکیاں، نئی گدگدی، نئی لرزشیں، نئی سہرن، ان کے
ہاتھوں سے غم کی دکھی ہوئی رگوں کو ملیں۔

فانی کے کلام سے باوجود متاثر ہونے کے کچھ بے اطمینانی
یا غیر آسودگی فطری چیز ہے، ان کی زندگی ہی میں لٹکن (Pendulum)
نے دوسری انتہا (Opposite extreme) کی جانب پینگ
ماری تھی، اصغر کی نشاط روح "سرورِ زندگی" کے نغموں میں لیکن
اصغر کے ردِ عمل سے بھی بے اطمینانی اور غیر آسودگی ہو ہی جاتی ہے
زندگی نہ غم سے خوش نہ خوشی سے خوش۔ مارکس اور اس کے
ہم خیال جہاں اقبال کے کلام کو فاشسٹی بتائیں گے۔ فانی و اصغر
کے کائنات خیال و فکریات کو چھٹ بھئیے شہری متوسط طبقے کے اثرات
(Petty bourgeois) بتائیں گے۔ بہر حال یہ بات
سوچنے کی ہے ضرور کہ اگر فانی اشتراکی تہذیب و تمدن کی فضا میں
آنکھیں کھولتے، پلتے اور بڑھتے، اپنی حسن و عشق پرستی سمیت تو

کیا وہ اور ان کی شاعری بہت کچھ بدلی ہوئی چیزیں نہ ہوتیں
برنارڈ شا نے اپنے ایک ناٹک میں لکھا ہے کہ ٹوٹا ہوا دل اور بھری ہوئی
جیب آدمی کو بہت موافق آتے ہیں، دورِ سرمایہ داری خاص کر
کسی غیر سرمایہ دار ملک کی غلامی میں رونا تو یہ ہی ہے کہ انفرادیت
(Individualism) یا نفسی انفرادیت یا شخصیت کو مٹا
کر رکھ دیتی ہے۔ کم سے کم فرد کو مٹانے میں انفرادیت کوئی دقیقہ
اٹھا نہیں رکھتی۔ مجھے اپنا شعر یاد آ گیا ؎

خود اپنے جیتے مُردے کو تجھے دینا پڑے کاندھا
گراں اس درجہ بارِ انفرادیت نہ ہو جائے

ٹیگور بھی کہتے ہیں:-

O fool, to try to carry thyself on thine own shoulders, to beg at thine own door!

میر، غالب، فانی اگر یہ بوجھ ڈھونے میں کھپ ہو گئے یا
کھپ ہوتے ہوتے رہ گئے اور اگر ذوق، سودا، آتش وغیرہ
کسی طرح اس طبل میں نکل بھاگے تو بھی یہ سوال ضرور اٹھتا ہے
کہ شاعرانہ سوز و گداز کا کیا یہی مفہوم ہے کہ ہم دُکھ سے ہم آہنگ
ہو جائیں، دُکھ سے وجدانی کیفیت حاصل کرنے کی صلاحیتیں اپنے
اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ دُکھ میں جمالیاتی قدریں

(Aesthetic Values) ڈھونڈتے پھریں یا روحانی قدریں
فانی کی شاعری کی غرض و غایت ایک خاص دلکش و دلفریب
انداز سے خفیف و لطیف چٹخاروں کے ساتھ اپنے دل کا لہو چاٹنے
تلخ کو خوش گوار بنالینے، دکھ کو سکھ بنانے اور بیماری کو پہلے مدتی
(Chronic) بنا کر اسے صحت سمجھنے کے سوا اور کیا ہے؟ فانی کے
پہلے میر درد دہلوی کے بھائی میر اثر کا دیوان ایک ایسی چیز ہے
جس کے اثر تخیل کو اس طرح دکھاتے ہیں کہ سینہ دکھنے لگتا ہے،
اثر کے یہاں ٹھیٹ درد ملتا ہے فانی کے یہاں وہ لطیف ہو گیا
ہے اور نفسیاتی سکون کے عناصر اس میں مل گئے ہیں۔ کیونکہ فانی
میں ایک ایسی رنگ ہے جو دکھی ہوئی بھی ہے اور فلسفیانہ بھی، مگر
بات جہاں کی تہاں رہتی ہے۔
سو سوالوں کا ایک سوال یہ ہے کہ زمانہ یا تاریخ جس انسان
کے منتظر ہیں اور جس انسان کو جنم دینے میں مدد دینا ادب و شاعری
کا کام ہے وہ انسان فانی کی شاعری میں انگڑائی لیتا ہوا نظر
آتا ہے یا نہیں۔ حافظ کی شاعری میں تو کچھ ایسے انسان کی
جھلک مل جاتی ہے۔ کچھ خیام کی رباعیوں میں بھی کچھ دھندلی سی
کالیداس اور فردوسی کے صفحات میں بھی، اور اگرچہ آپ یہ
سن کر چونکیں گے۔ میر کے نغموں میں بھی۔ رجائیت و قنوطیت
بر طرف، کیا ہم شاعروں کی کوئی ایسی تقسیم نہیں کر سکتے جس کی

رَ دوسے ایک قسم کے شاعر تو وہ ہوں گے جو زمانہ اور زندگی کے ہاتھوں مٹنے میں ایک شان پیدا کر لیتے ہیں۔ انحطاط اور موت کو حسین بنا دیتے ہیں۔ دوسرے وہ شاعر ہیں جو "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز" کے نعرے پہ آگے بڑھتے ہیں اور شکست و فتح جو کچھ بھی ہوا اتنا تو کہلوا ہی لیتے ہیں کہ "مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا"۔ فانی کے یہاں ہمیں جو چیز بیک وقت اپیل کرتی ہے اور ہمیں غیر آسودہ بھی کرتی ہے، وہ ہے روحانی ناکامیوں کے ہاتھوں مٹنا، اور اس مٹنے کو اتنا معصوم، پاکیزہ اور حسین بنا دینا۔ یہ مساکیت (Masochism) ہوتی ہے۔ بہت دلکش و نظر فریب، لیکن ہے خطرناک چیز۔

اگرچہ زندگی غم و خوشی سے بالاتر چیز ہے۔ اگرچہ انسانی فلاح و ترقی کا محض یہ مقصد نہیں کہ انسان خوش رہے۔ بقول برنارڈشا کے محض احمق آدمی خوش رہنا چاہتا ہے۔ پھر بھی غم و خوشی مقصد زندگی نہ ہوتے ہوئے بھی مقصد زندگی کی طرف بڑھنے میں محرک ضرور ہیں۔ نطشہ کا قول ہے کہ درد کے روحانی بننے کا نام ترقی ہے (All Progress is the spiritualisation of pain) مگر ولیم جیمس خوشی یا نشاط کو زندگی کا مسئلہ نہیں مانتا مگر غم کو مسئلہ و معمہ مانتا ہے۔ (There is a problem of evil, there is no problem of good)

۸۸

سچ اور جھوٹ کے بارے میں بھی کچھ اسی طرح کی بات کہی جاتی ہے:-
(Truth is simple, but there is no such thing as a simple lie)

ہاں گوتم بدھ نے ضرور خوشی نشاط یا آنند کو بھی کرب معکوس کہا ہے۔ بہرحال انسانی تہذیب کے آغاز سے انسانی علوم و فنون کے آغاز سے دُکھ سُکھ، درد و راحت، اضطراب و سکون، غم و نشاط وہ چیزیں ہیں جو زندگی اور شاعری میں رچی بسی ہیں۔ غم منزل نہ سہی لیکن کاروان حیات کی بانگ جرس کی آواز کا ایک جزو تھا۔ ہے اور رہے گا۔ کوئی سمجھدار، ترقی پسند یا اشتراکی یہ نہیں مانتا کہ نئے نظام کے قائم ہونے کے بعد زندگی سے غم غائب ہو جائے گا۔ غم تو جنّت میں بھی آدمی کا ساتھ نہ چھوڑے گا۔ ع

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت غالبؔ

سوال یہ ہے کہ غم ہمارے ساتھ کیا کرے اور ہم غم کے ساتھ کیا کریں۔ شاید اس کا بہتر جواب شاعر دے سکتا ہے لیکن کیا دیتا بھی ہے؟

بقول اقبالؔ:-

خبر نہیں کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

پس اگر غم بھی ہمارے لئے حیاتیات (Vitamins) میں سے ہے۔ تو وہ غم کیسا ہو۔ ہمیں وہ کس طرح بنائے اور بگاڑے؟ اس کو سمجھنے میں شاید یوں کچھ مدد ملے کہ ہم اپنے آپ سے پوچھیں کہ زندگی کیا ہو، کیسی ہو؟ ہم اسے اور وہ ہمیں کس طرح بناتے اور بگاڑتے ہیں یعنی زندگی کے جدلیات کا ہم کیا نظریہ رکھتے ہیں۔ یہ بہت بڑے پیچیدہ اور اہم سوالات ہیں۔ یہ آدمؑ کی الجھائی گتھی کو سلجھانا ہے۔ صرف چند اشارے ممکن ہیں۔ ناخن کے چند کچوکوں سے زندگی میں زندگی کی گتھی سلجھانے کی فرصت کہاں۔ لیکن جو فرصت کے لمحے ہیں غنیمت ہیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ غم ہو یا خوشی انسان کو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ جزوِ کائنات ہے۔ وہ کائنات سے علیحدہ ہو چکا ہے وہ ایک تارہ ہے جو آسمان سے ٹوٹ چکا ہے۔ اس علیحدگی کا راز سمجھنا اور نئے سرے سے آفاقیت کی طرف بڑھنا شاید انسانی تاریخ کا بھی وہ راز ہے جس کی طرف اقبالؔ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے ع

کارِ جہاں دراز ہے   اب مرا انتظار کر

ہاں تو غم میں بھی آفاقی وسعت پیدا کرنا غم کا صحیح استعمال ہے۔ فانی کی دلفریب شاعری میں اس وسعت کا احساس ہمیں اس سے غیر آسودہ رکھتا ہے لیکن محض آفاقیت کافی نہیں شوپنہاور کے فلسفے میں ٹامس ہارڈی کی نظموں اور افسانوں میں غم کو ہم آفاقی

پیمانے پر کارفرما دیکھتے ہیں اور پھر بھی ہم کو تشفی نہیں ہوتی نہ ہمارا دل
غم کے اس نظریہ و فلسفہ کے صحیح ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ آفاقی
وسعتیں رکھتا ہوا بھی یہ غم یک طرفہ معلوم ہوتا ہے۔

والٹر رالے نے شکسپیر کے متعلق لکھا ہے۔

(Shakespear was that rarest of things
a whole man ــــــ) اور بن جانسن نے شکسپیر میں یہ
صفت بتائی ہے:-

"To see life steadily and to see it whole"

خود شکسپیر نے شاعر کا مقصد یوں بیان کیا ہے:-

"To hold the miror up to Nature"

ہاں تو شاعری میں عظمت، عالم گیری اور پائندگی کے لئے
آفاقی وسعت ایک صفت ضرور ہے، لیکن وہ سب کچھ نہیں
ہے۔ کائنات ایک بیکران خلا نہیں ہے۔ وہ محض ایک
وسیع البسیط فضا نہیں ہے۔ وہ ایک ٹھوس بھرپور حقیقت ہے
وہ "رنگا رنگ بزم آرائی" ہے، جیتی جاگتی چلتی پھرتی دنیا ہے۔
ایک دائمی محشرستان ہے۔ اس کا چہل پہل کی تموج، اس کے بحر
ذخار میں موج کا موج سے ٹکرانا اور پھر مل کر ایک لہر بن جانا اور
اس طرح جوار بھاٹوں کا لامتناہی سلسلہ، یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا جیون
ساگر، یہ چڑھتا اور اترتا ہوا پانی شاعر کے نغموں میں چھلکتا ہوا

اور لہراتا ہوا نظر آنا چاہیئے ۔ کائنات و حیات کی ترجمانی یا مصوری
وہ شاعری بہت ناقص طور پر کرے گی جس سے فن کارانہ خوبیوں
کے باوجود یک رنگی یا اک سُرا پن ہو۔ بڑی شاعری میں شاعر کی
آواز نہیں سنائی دیتی، سنسار سنگیت سنائی دیتا ہے ۔ وہی صاحبِ
طرز بڑا شاعر ہے جس کا طرز، طرزِ کائنات ہے ۔ شاعری میں جیون
کا ناٹک صاف صاف دکھائی دینا چاہیئے ۔ اس کا المیہ اور طربیہ
اس کے قہقہے اور اس کے نالے اس کی حیرتیں اور مانوسیتیں،
اس کی شگفتگی اور اُداسیاں، ابھار اور درماندگی، نور و ظلمت
حرکت و سکون، عمل اور بے بسی، قدرتیں اور مجبوریاں، لگاؤ
اور بے لاگی، عذاب و ثواب، اور خیر و شر، انکار و اقرار، مادیت
اور روحانیت، خارجیت و داخلیت، حرارت و ٹھنڈک،
غرض کہ ضدین کے بے شمار جوڑے (Pairs of opposites)
ٹکرا ٹکرا کے ایک ہو جاتے ہوئے اونچی شاعری کے نغموں میں
نظر آتے ہیں ۔ یہاں بے شمار لا الٰہ کے نعرے باہم گھل مِل کر الا اللہ
کا نعرہ بن جاتے ہیں ۔ ہزاروں "نہیں" مل کر ایک "ہاں" ہو جاتے
ہیں ۔ ڈاستاوسکی کہتا ہے کہ سزائے قتل پا کر ہر مجرم پھانسی کے
تختے پر حضرت عیسیٰ مسیح سے مشابہ معلوم ہونے لگتا ہے ۔

لیکن ...... ہاں اس معاملہ میں ایک "لیکن" بھی ہے ۔
اپنے تمام طمطراق کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ جہان نما شاعری

فانی کی سی متغزلانہ شاعری کی طرح سے دل کو لگے۔ چکبست کی شاعری لاثانی فن کارانہ شاہکار ہے۔ کتنی سجی سجائی ہے کتنی پرتکلف ہے۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی، اس کے ساتھ ہی کافی مختلف العنوان سماجیت کی اس میں کتنی پٹ ہے اور اس کے نغموں کا بھی قریب قریب وہی زمانہ رہا ہے جو فانی کے نغموں کا زمانہ تھا لیکن فانی کے نغموں کے پھول ابھی تازہ ہیں اور چکبست کے نغمے افسردہ ہو چلے ہیں۔ فانی کی "تنگنائے غزل" کی بزم اب تک سجی ہوئی ہے۔ وہاں آکر دل بیٹھا سا جاتا ہے لیکن اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور بزم چکبست میں "چل چلاؤ" لگے ہوئے مدت ہو چکی ہے۔ بات کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ شاعری میں پائندگی اور ہمیشگی کی صفات اس وقت آتی ہیں جب جہان رنگ و بو کو ورائے رنگ و بو بھی بنا دیا جائے جب کسی اور عالم میں جاکر زمان و مکان آنکھیں جھپکانے لگیں، جب شدید احساس تحیّر میں بہ سے لنے لگے جب محدود اور غیر محدود میں جھپکیں ہونے لگیں جب لفظ و بیان اپنے لغوی حدود توڑنے لگیں جب شاعر کا خلوص رموز بے خودی سے آشنا ہونے لگے، جب یہ بھری دنیا ایک جاگتا خواب نظر آنے لگے۔ میری یہ گذارش ہے کہ اگرچہ فانی کی غزل میں بجائے حیات و کائنات کے صرف فانی کی حیات و کائنات ملتی ہے۔ لیکن فانی کی اتم کتھا — (Spiritual

(autobiography) میں جو معصوم تجربہ ہے اس کے خلوص کا جو اندازہ ہے اس میں ہمیشگی کی جو ایک تھرتھری سی اور ایک جھلک سی ہے، اس کے آنسوؤں کے قطروں میں جو ایک سازِ سرمدی ہے وہ چکبست کے یہاں نہیں ہے۔ یعنی نغمگی کا وہ راز (secret of lyricism) نہیں ہے ؎

اسی سے اُٹھ رہے ہیں شعلہائے سازِ سرمدی

بس ایک سوز بے اثر بس ایک سازِ بے صدا

اس لئے محدود اور نامکمل ہوتے ہوئے بھی فانی کی غزل وہ حسین کمزوریاں، وہ نازک بے بسی، وہ پُرخلوص و معصوم سعیٔ بے حاصل اپنے اندر رکھتی ہے کہ آج بھی، کل بھی، پرسوں بھی اور شاید دُنیا کے بدل جانے پر بھی اس پر زندگی کے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی آنکھیں پڑتی رہیں گی۔ اور کبھی کبھی اس طرف کان لگ جایا کریں گے۔ مستقبل کی دنیا محض تنقید کا مدرسہ نہ ہوگی محض نکتہ چینی کا نام کلچر نہ ہوگا۔ محفلِ حیات و محفلِ ادب وہ جگہ نہ ہوگی کہ ؏

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

مستقبل بیتے ہوئے جگوں کو بھلا نہ دے گا۔ زندگی کا ہر بہروپ میں خیر مقدم کرے گا۔ ہومر اور والمیکی، فردوسی اور خاقانی کی دُنیا ہمارے لئے غیر مانوس دُنیا نہیں ہے۔ ہمارے بعد کی انسانی دُنیا کے لئے فانی کی شخصیت اور اُن کی آواز ایسی چیزیں نہ ہوں گی جسے

لوگ پہچان نہ سکیں، فانی کی زندگی گھائل زندگی سہی، لیکن ہے وہ بھی زندگی۔ جب وہ مستقبل کی زندگی کو آواز دے گی تو وہ زندگی بھی اس کی آواز پر آواز دے گی۔ فانی خود کہہ گئے ہیں ؎

آتی رہے گی خیر اب اس زندگی کو موت
یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی

ایسے اشعار کو جنازے بازی یا مرگھٹ کا رونا کہنا تنقید نہیں ہے جھلاہٹ ہے۔ ایسی جھلاہٹ جس پر خود فانی بھی مسکرا دیتے۔ فانی کے شعور اور تخیل کو علیل اور بیمار کہنا بجا اور برحق لیکن یہ بھی ہم کیوں بھول جائیں کہ تاریخ انسانیت بیمار پڑ پڑ کر اپنے کو صحت یاب بناتی ہے۔ شاعر کی زندگی بسا اوقات انسانی تاریخ کے ان بحرانی وقفوں کی نشانی اور علامت ہوتی ہے۔ جو بیک وقت زندگی اور موت کے امکانات کے حامل ہوتے ہیں۔ شاعر عذاب زندگی و گناہ زندگی کا کفارہ کرتا ہے۔ وہ دُنیا کی نجات کے لئے صلیب یا پھانسی کے تختے پر چڑھتا ہے۔ اس کا غم دُنیا کے غم کا اسہال (Cathaisis) ہے۔ وہ اپنے دِل کی کسک میں دنیا کی کسک کو جذب کر لیتا ہے اپنے آنسوؤں سے دھو کر زندگی کی گرد آلود فضا کو صاف کر دیتا ہے۔ دن جھلک دار اور رات سہانی ہو جاتی ہے۔ میرے مندرجہ ذیل اشعار میں شاید اس اصول کی طرف اشارہ ہے:۔

تاریخ زندگی کے سمجھ کچھ محرکات
مجبوراتنی عشق کی بے چارگی نہیں

نکل رہیں گے ہزاروں نشاط کے پہلو ابھی فسانۂ غم کو تمام ہونا ہے

حضرت ایوب کا قول ہے " تو پہلے ایک قوم کو وسعتیں دیتا ہے پھر اسے سیدھا کرتا ہے۔ (Thou enlargeth a nation)

میر اور داغ کی خوش نگریوں کے بعد فانی کی گھٹی ہوئی چٹیلی آواز غالباً زندگی اور ادب کی تاریخی لوازمات میں سے تھی، وہ میر و داغ کے قہقہے تھے جو فانی کی فریاد و فغاں بن گئے تھے۔

میں نے فانی کو دیکھا نہیں تھا۔ لیکن یہ غم آگیں اور خوش نصیبی مجھے ضرور نصیب ہوئی کہ ان کے مرنے کے پہلے ان کی آواز میں نے سُن لی تھی۔ آہ آنسو میں ڈوبی ہوئی وہ آواز جو دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔ یوں تو میں ریڈیو نہیں سنتا لیکن نہ جانے کیوں ۱۹۴۱ء کی جنوری میں جب بھوپال کا مشاعرہ ہو رہا تھا میں نے اپنا ریڈیو ٹیون کر لیا۔ فانی کے نام کا اعلان ہوا۔ محبت اور قدرشناسی سے میرا دل امنڈ آیا میں بے چین ہو کر گوش بر آواز ہو گیا۔ فانی نے عجیب ڈوبی ہوئی آواز میں وہ غزل سنائی ؎

جب پرسشِ غم وہ کرتے ہیں کیا جانئے کیا ہو جاتا ہے
کچھ یوں بھی زباں نہیں کھلتی کچھ درد سوا ہو جاتا ہے

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا وجود آنسوؤں میں تحلیل ہو جائیگا

ان کی دوسری غزل اسی مشاعرے میں جگر نے پڑھی۔ ع

"ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور"

لیکن سُنا ان سُنا برابر رہا" کم سے کم میرے لئے۔ شاید فانی کی یہ آخری غزلیں تھیں اور عجب کیا یہ باقیات فانی علی گڑھ میگزین کے اس فانی نمبر میں شائع ہوں۔

ہندوستان کی بدلی ہوئی زندگی اور شاعری کی طرف سے، اے تصویر غم و مصور الم۔ اے لاثانی فن کار، اے ہماری تہذیب کے انسانی شرافت کے، ہمارے دُکھ درد کے نمائندے۔ اے درد زندگی کے مترنم ساز، اے تبسم تکلّف تکلّف تہنے والے انسانی زندگی کے مجبوریوں اور کمزوریوں کو اپنے آنسوؤں سے سینچ کر پاک بنا دینے والے، اے نا زحیات ہماری ڈبڈبائی آنکھوں کا سلام لے۔ تُو ہماری دُنیا میں تھا۔ تُو کیا گیا کہ ع

دُنیا گذر گئی غم دُنیا لئے ہوئے

یاسیاتِ فانیؔ

منیر احمد

پے در پے ناکامیاں بعض اولوالعزم انسانوں کی ہمت کو دو بالا اور حوصلہ کو بلند کر دیتی ہیں۔ وہ ناسساعد حالات سے گھبرا اُٹھنے کے بجائے آمادۂ بغاوت ہو جاتے ہیں اور دُنیا میں کچھ کر گذرتے ہیں۔ لیکن اکثر آدمی جلد ہی سپر انداز ہو کر پسپائی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی شکست خوردہ ذہنیت ان کی قوتِ عمل کو سلب کر لیتی ہے۔ سوچنے اور زمانہ سے ستیزہ کار ہونے کی اہلیت مفقود ہو جاتی ہے۔ ایک گہرا قنوط اور دائمی مایوسی ان کو گھیر لیتی ہے پھر ان کو دنیا میں غم ہی غم، حرماں ہی حرماں، ناکامی ہی ناکامی اور بے بسی ہی بے بسی نظر آتی ہے۔ وہ خود کو مجبورِ محض پاتے ہیں اور جی کے بہلاوے کے لئے ایسی تاویلیں بھی گھڑ لیتے ہیں جن سے وہ یہ بھی سمجھ بیٹھتے ہیں کہ نہ صرف وہ ہی بلکہ تمام دُنیا انہی کی طرح مجبور و دست و پاشکستہ ہے۔ اسی قسم کی مجبوری، معذوری، قنوط یاس اور شکست خوردگی فانی پر طاری تھی۔ ان کی زندگی اور ان کی شاعری میں پوری ہم آہنگی اور مکمل تطابق تھا۔ ان کو زندگی کے تجربے تلخ اور مایوس کن ہوئے۔ انہوں نے ہمت سے کام نہیں لیا۔ بادِ مخالف کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے وہ تن بہ تقدیر

ایک کاہ خشک کی طرح اس آندھی میں اڑ گئے۔ فانی کی طبیعت انفرادیت پسند تھی اور خود تنک مزاج اور لئے دیئے رہنے والے انسان تھے۔ لیکن زمانہ ہر بانکے کی آن توڑنے پر آمادہ اور کمربستہ رہتا ہے۔ یہ تو اسی کے قابو میں آتا ہے جو اپنی دھن میں لگا رہے اور جس کا عمل ہے۔ ع۔

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

پر ہو۔ فانی کی آرزوئیں اور تمنائیں بہت تھیں۔ لیکن جہد کرکے ان کو حاصل کرنے کی سکت ان میں نہیں تھی، لیکن بنا بنایا لقمہ کس کے منہ میں گیا ہے جو ان کو ہی مل جاتا۔ زمانہ نے ابھرنے کے مواقع کئی بار دیئے۔ لیکن یہ اپنی آن پر اس شدت سے قائم تھے کہ ان مواقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کے بجائے انہوں نے ان کو ٹھکرا دیا۔ یہی ان کی غلطی تھی اور اسی غلطی کا خمیازہ انہوں نے تمام عمر اٹھایا۔ ہر ناکامی کے بعد یہ اور ہمت ہارتے گئے۔ دُنیا نے ان کے دامن مُراد کو بھرنے میں جس قدر بخل سے کام لیا فانی ایک ضدی بچہ کی طرح اسی قدر زیادہ کے طلب گار اور اُمیدوار ہوئے۔

[فانی فطری طور پر شاعر تھے۔ قدرتاً ان کا دل حساس تھا اس لئے انہوں نے اپنے خود پیدا کردہ غموں کو اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ ایک مجسم غم اور سرتاپا یاس بنکر رہ گئے

دنیائے ادبِ اردو میں ایسی مثال ایک اور بھی ملتی ہے۔ وہ ہے میر کی ذات۔ میر کی زندگی اور شاعری میں بھی فانی کی طرح ہم آہنگی سے ہے۔ ان کی زندگی تلخ اور ترش گزری، ان کا زمانہ عالم اختلال و انتشار کا زمانہ تھا۔ جس کا ہر شخص شکار رہتا۔ خود ان کے اعزا و اقربا کا سلوک ان کے ساتھ ناروا ہوا۔ بچپن ہی میں باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ مربیوں اور سرپرستوں نے کماحقہ آرام نہیں پہنچایا۔ تعلیم صوفیانہ اور درویشانہ ملی۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ تیغ عشق کے گھائل ہوئے اور اس میں بھی ناکامی دیکھی۔ بدنامی اور غریب الوطنی نصیب ہوئی۔ زمانہ نے ان کے کمال کی پوری قدر نہ کی۔ ان سب باتوں نے مل جل کر میر کو ایک سوز مجسم بنا دیا تھا۔ لیکن میر اور فانی میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ میر کو جب کوئی دکھ پہنچتا ہے یا ان کے دل میں درد اٹھتا ہے تو وہ ایک آہ بھر لیتے ہیں۔ اور یہ آہ نہ صرف ان کے لئے دل دوز ہوتی ہے بلکہ سننے والے بھی تلملا اٹھتے ہیں۔ مگر جب فرصت ہوتی ہے تو قہقہہ نہیں تو ایک ہلکے سے تبسم سے بھی گریز نہیں کرتے اور چلبلاہٹ نہیں تو ایک لطیف شوخی ہی ان کے چہرہ پر رقص کرکے ایک لمحہ کے لئے ہی سہی نور و سرور پیدا کر دیتی ہے:-

کھلا نشہ میں جو پگڑی کا پیچ اس کے میر
سمند ناز کو ایک اور تازیانہ ہوا

دیکھیں تو تری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں،
اب ہم نے بھی کسی سے آنکھیں لڑائیاں ہیں

نازکی اُن لبوں کی کیا کہیے پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے
میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

ڈوبے اچھلے سے ہے آفتاب ہنوز
کبھی دیکھا تھا تجھ کو دریا پر،

وصل میں رنگ اڑ گیا میرا کیا جدائی کو منہ دکھاؤں گا

کل بارے ہم سے اُن سے ملاقات ہو گئی
دو دو دہن کے ہونے میں ایک بات ہو گئی

دِل پُرخون کی اک گلابی سے عمر بھر ہم رہے شرابی سے
کھِلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے ان کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
بُرقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا داغ ہوں ان کی بے حجابی سے

[لیکن فانیؔ اس عارضی اور وقتی خفت غم سے بھی محروم ہیں غم نے ان کو ایسا گھیرا کہ یہ غم ہی کے ہو رہے۔ فانیؔ غم تلاش کرتے ہیں، غم پیدا کرتے ہیں، غم کی پرورش کرتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ خطرناک اور لاعلاج بات یہ ہے کہ غم ہی میں سکون پاتے ہیں]

در دِلِ ما غمِ دنیا، غمِ معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

والا معاملہ ہے:۔

اجل کی آرزو دل میں فانی اور دنیا ہو
خدا رکھے یہی رونق ہے اس اُجڑے تیئے گھر کی

قربان ایک آمد غم پہ ہزار دل
صدقے اس ابتدائے قیامت مآل کے

اے یاس تو نے آ کے اسے بھی مٹا دیا
لذت سی کچھ جو شکوۂ رنج و محن میں تھی

شب فرقت کٹی یا عمر فانی   اجل کے ساتھ آمد ہے سحر کی

میر انسان تھے، ان کا محبوب انسان تھا، میر اسی دنیا کے آدمی تھے، ان کا محبوب بھی اسی دنیا کا آدمی تھا۔ وہ کبھی روتے ہیں، کبھی چیختے ہیں، کبھی چپ ہو رہتے ہیں، کبھی تھک کر سو رہتے ہیں۔ کبھی ایک نظر ہی مل جانے پر خوش ہو جاتے ہیں، کبھی امید وصل میں مگن ہو جاتے ہیں، کبھی سرمست محبوب کو دیکھ کر خود بھی مست و بے خود ہو جاتے ہیں۔ ہجر میں گھلتے اور جان کھوتے ہیں لیکن آرزوئے وصل اور امید ملاقات کا رشتہ کبھی ہاتھ سے نہیں دیتے۔ غم یاس اور محرومی مقصود بالذات نہیں ہیں۔ لیکن فانی ایذا دوست، تلخ پسند اور غم پرور ہیں۔ وہ غم کے ہاتھوں ایسے لاچار ہو گئے کہ غم ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے۔ غم سے چھٹکارا پانے کے بجائے غم ہی کو وجہ سکون سمجھنے لگے۔ ان کا چہرہ مسرت کے نور اور تبسم کے سرمایہ سے محروم ہے۔ غم نے ان کی طبیعت کو سرد کر دیا اور دنیا کو ان

کی آنکھوں میں اندھیر۔ اُن کو ہر نفس جنازۂ آہِ بے تاثیر اور عمر گذشتہ کی میّت، ہر تبسّم پردہ دار غم اور ہر گل شگفتہ، محرم رازِ خزاں نظر آتا ہے:۔

نامُرادی حد سے گذری حالِ فانیؔ کچھ نہ پوچھ
ہر نفس ہے اک جنازہ آہِ بے تاثیر کا

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا

مذاقِ تلخ پسندی نہ پوچھ اس دل کا
بغیر مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا

فانیؔ زمینِ گورِ عزیزاں ہے لالہ زار
پھر فصلِ گل میں خاک ہوئی ترجمانِ داغ

یاں نہ کسی طرح کٹی جب مری زندگی کی رات
چھیڑ کے داستانِ غم دل نے مجھے سلا دیا

فانیؔ تمام اُلجھنوں اور پریشانیوں کا واحد علاج موت کو سمجھتے ہیں۔ ان کی تمام عمر آرزوئے مرگ ہی میں گذری اور وہ مرنے ہی کی امید میں جیتے رہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام شاعری موت، جنازہ اور قبر کی ایک داستانِ طولانی ہے۔ مرگ اور آرزوئے مرگ ان کی شاعری کا سب سے بڑا اور نمایاں موضوع ہے۔ گو بار بار کے دھرانے سے کہیں کہیں لطفِ سخن میں کمی آگئی ہے لیکن ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں ہے جو اپنا جواب نہیں رکھتے:۔

آتی رہے گی خیر اب اس زندگی کو موت
یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی

اپنی تو ساری عمر ہی فانی گذار دی
اک مرگِ ناگہاں کے غم انتظار میں

اب مری لاش پر حضور موت کو کوستے تو ہیں
آپ کو یہ بھی ہوش ہے کس نے کسے مٹا دیا

آج روزِ وصالِ فانی ہے
موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

کب سے آغوشِ لحد میں ہم ہیں سرتاپا قرار
وہ ستم پرور ہے اب تک بدگماں اضطراب

مری اک عمر فانی نزع کے عالم میں گزری ہے
محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں

چھٹے جب قیدِ ہستی سے تو آئے کنجِ تربت میں
رہا ہوتے ہیں یعنی ہم بدل دیتے ہیں زنداں کو

فانی کی اس قنوطی اور یاس پسند طبیعت نے ان کو عقیدۂ جبر کا قائل بنا دیا اور اسی عقیدہ نے ان کی یاس میں اور اضافہ کیا اگر ان کو اختیار کی کوئی جھلک نظر بھی آجاتی ہے تو وہ اس کو اپنی نظر کے دھوکے یا فطرت کی عیاری پر محمول کرتے ہیں۔ قدرت کی اس فریب دہی اور اپنی فریب خوردگی پر کبھی جھنجھلاتے

ہیں۔ اور کبھی آہ بھر کر پڑ رہتے ہیں۔

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

دعوئے یہ ہے کہ دوریٔ معشوق ہے محال
مطلب یہ ہے کہ قرب نہیں اختیار میں

دُنیا میں حالِ آمد و رفتِ بشر نہ پوچھ
بے اختیار آ کے رہا بے خبر گیا

فانیؔ ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

جلوہ اختیار سے نسبت جبر ہے مجھے
شعلۂ آرمیدہ ہوں وادیٔ برق نازمیں

فانیؔ دُنیا کو ایک وہم، ہستیٔ انسانی کو بے بنیاد اور کائنات کو محض بے حقیقت سمجھتے ہیں۔ عیش و مسرت کے وہ سرے سے قائل ہی نہیں اور اگر دُنیا میں کہیں کوئی آثار حیات یا شمّہ برابر مسرّت دیکھتے بھی ہیں تو اس کو آفت کا پیش خیمہ اور زوال کا نشان سمجھتے ہیں میرؔ نے گُل کا ثبات کلی کے تبسم تک تو سمجھا، مگر فانیؔ تو پیغام بہار کو بھی پیغام خزاں ہی تصور کرتے ہیں اور ہر کلی کو تصویر افسردگی پاتے ہیں:۔

بہار لائی ہے پیغامِ انقلابِ بہار ۔ سمجھ رہا ہوں میں کلیوں کے مسکرانے کو

اِس باغ میں جو کلی نظر آتی ہے تصویر فسردگی نظر آتی ہے
غم امید کے صدقے وہ اضمحلال رنگیں ہوں
بہار آنے سے پہلے ہی جو چھا جائے گلستاں پر

کشمیر جنت نظیر میں بھی سامان آسودگی ڈھونڈنے کے بجائے ان کی متجسس غم طبیعت غم و اندوہ کے انبار لگا دیتی ہے۔

پھولوں کی نظر نواز رنگت دیکھی مخلوق کی دل گداز حالت دیکھی
قدرت کا کرشمہ نظر آیا کشمیر دوزخ میں سموئی ہوئی جنت دیکھی

بعض معترضین کا کہنا ہے کہ فانی کی نظر تنگ اور تجربہ محدود تھا۔ وہ زندگی کا صرف ایک رُخ دیکھ سکے اور اسی پر قانع رہ کر اسی پر اپنے فلسفۂ حیات کی بنیاد رکھ لی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ اعتراض کسی حد تک غلط ہے کیونکہ خوشی اور مسرت بھی انسان کو ایسا ہی تنگ نظر بنا دیتی ہے جیسا غم و اندوہ بلکہ ایک غمگین انسان تو کچھ غور و فکر کر بھی لیتا ہے۔ ربودۂ مسرت انسان تو بالکل ہی آپے میں نہیں رہتا۔ ہاں یہ ضرور کہونگا کہ فانی کی دُنیا ایک خاص دُنیا ہے۔ ان کا طریقۂ تفکر مخصوص ہے اور ان کا نظریۂ حیات جدا ہے۔ ان کے فلسفۂ غم کی گہرائی اور ان کی قنوطی طبیعت کی جولانگاہ ایک فریب خوردۂ مسرت و شادمانی کے حلقۂ فکر سے کہیں زیادہ ہے دُنیا میں غم کے آفات مسرت کے لمحات سے کہیں زیادہ ہیں ایک زخم خوردہ دِل ایک غم ناآشنا دِل کی بہ نسبت دنیا کو بہتر طریقہ پر

جان سکتا ہے۔

یاس و حرماں نے فانیؔ سے (اس زمانہ کے لحاظ سے) کام کی باتیں توکم کہلوائیں۔ لیکن ان کی شاعری میں ایک خاص امتیازی شان ضرور پیدا کردی ہے۔ ان کے کلام میں جو تاثیر شدتِ جذبات گدازاور دل نشینی ہے وہ سب ان کی غم انگیز طبیعت ہی کی بدولت ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان کے اکثر اشعار سلاست، سادگی بے تکلفی، سوز و گداز اور اثر انگیزی میں میرؔ کے اکثر اشعار کے ہم پلہ ہو گئے ہیں:-

ہجر کے بھی ہزار پہلو تھے — یوں بھی اک وضع پر بسر نہ ہوئی
ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا — بات پہنچی تری جوانی تک
اور ہی بل ہے تری زلفوں میں آج — کون گرفتارِ بلا ہو گیا
موت کا انتظار باقی ہے — آپ کا انتظار تھا نہ رہا
کیا چھپاتے کسی سے حال اپنا — جی ہی جب ہو گیا نڈھال اپنا
موت ان کا منہ ہی تکتی رہ گئی — جو تری فرقت کے صدمے سہہ گیا

جن میں تمہارا نور رہا تھا ان میں اندھیرا رہتا ہے
جب سے گئے ہو آنکھوں میں آنسو تو بہت نور نہیں

پھر کسی کی یاد نے تڑپا دیا
پھر کلیجہ تھام کر ہم رہ گئے

یہ سوز و گداز اور دل نشینی اس وقت بھی قائم رہتی ہے

جب وہ تصوف یا فلسفہ کا کوئی دقیق اور خشک مسئلہ بیان کرتے ہیں ۔ فانی نے زندگی پر اپنے مخصوص انداز میں ایک گہری نظر ڈالی ہے اور اس کے حقائق کو جگہ جگہ بیان کیا ہے ۔ لیکن کہیں کوئی خشکی، خشونت یا یکسانیت (یعنی عدم شعریت) نہیں ملتی ۔ انسان کائنات، حقیقت عالم، جبر و قدر، غرض تصوف اور فلسفہ کے اکثر مسائل کو حل کیا ہے ۔ اور طرح طرح کی موشگافیاں کی ہیں ۔ لیکن کوئی شعر محض فلسفہ بن کر نہیں رہ گیا ۔ غالب کا فلسفۂ حیات مشہور ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر مضامین غالب اور فانی کے آپس میں لڑ گئے ہیں ۔ لیکن ان کی مماثلت صرف اسی حد تک ہے کہ دونوں کا بنیادی خیال ایک ہی بیان ہوا ہے (اور یہ ناگزیر ہے) لیکن دونوں کے قریب قریب ہم معنی اشعار پڑھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہ سکتا کہ فانی نے غالب سے سرقہ کیا ہے یا غالب کی نقل کی ہے ۔ اگر فانی کے بالکل ہم مضمون شعر غالب کے شعر سے آگے نہیں بڑھے ہیں تو اسی درجہ کے ضرور ہیں، یا یوں سمجھ لیجئے کہ غالب کے اشعار اپنی جگہ ہیں اور فانی کے اپنی جگہ ۔ دونوں میں شعریت بدرجہ اتم موجود ہے ۔ شعریت کو ناپنے کا آلہ کوئی نہیں اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اور اس کے لئے صرف مذاقِ سلیم کی ضرورت ہے

وحدۃ الوجود تصوف کا سب سے بڑا اہم بالشان مسئلہ ہے

جب کلمۂ توحید کی تکرار اور ورد حد سے زیادہ بڑھ کر دل پر اپنا سکہ جما دیتا ہے تو لا الٰہ الا اللہ کی جگہ لا موجود الا اللہ لے لیتا ہے۔ تعین و تعدد اور اسماء و شئونات کے حجابات اور عابد و معبود اور خالق و مخلوق کے افتراقات درمیان سے اُٹھ جاتے ہیں۔ من و تو کی تمیز باقی نہیں رہتی بلکہ اس کا ہوش ہی نہیں رہتا عارف عالم بے رنگی میں پہنچ جاتا ہے جہاں کچھ بھی نہیں ہوتا اور جو ہوتا ہے وہ وہی ہوتا ہے۔ یہ کوئی دینیاتی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے۔ چونکہ جذبات سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ اس لئے شعراء کے لئے اس موضوع میں بڑی جاذبیت ہے چنانچہ جن فارسی اور اردو کے شعراء پر یہ واردات نہیں بھی گذری انہوں نے بھی اس پر بڑے شد و مد کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ فارسی کی غزلیہ شاعری کی گرم جوشی اور اثرانگیزی تو سرتاسر اسی بادۂ سرجوش کی رہین منت ہے۔ فارسی شعراء کی دیکھا دیکھی اردو کے اکثر شعراء نے بھی اس طرف توجہ کی ہے۔ فانی نے اس موضوع پر بار بار اور طرح طرح سے طبع آزمائی کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا عام طرز کلام اسی موضوع کے لئے تھا بھی موزوں۔

(چند نمونے)

ہر دل ہے تیرے غم کی امانت لئے ہوئے
ذرے ہیں اک جہانِ حقیقت لئے ہوئے

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

کیا کیا گلے نہ تھے کہ ادھر دیکھتے نہیں
دیکھا تو کوئی دیکھنے والا نہیں رہا

حُسن ہے ذات مری عشق ہے صفت مری
ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانہ کا

حقیقت عالم

ایک عالم کو دیکھتا ہوں میں
یہ ترا دھیان ہے مجسم کیا

آئینہ و دل دونوں کہنے ہی کی باتیں ہیں
تیری ہی تجلی تھی اور تو ہی مقابل تھا

اس عالم تصویر کو دیکھا تو یہ دیکھا
میری ہی نظر محو ہے میری ہی نظر میں

کیفیت ظہور فنا کے سوا نہیں
ہستی کی اصطلاح میں دنیا کہیں جسے

ما یہ اور اک ہستی ہوں تکلف برطرف
زندگی میری دروغ مصلحت آمیز ہے

فانی پرانی روش کے غزل گو شاعر تھے۔ ان کو نئے نظریات
کی کسوٹی پر جانچنا اور پھر نئے معیار پہ پورا اترتے نہ پاکر ان کی

عظمت میں شبہ کرنا سخت بد مذاقی ہے۔ فانی کی دُنیا ایک مخصوص دُنیا تھی۔ وہ اسی میں رہتے اور سانس لیتے تھے۔ ان کا ہر نفس ایک آہ اور ہر سانس ایک نالہ تھا۔ ان کی ہر کروٹ میں ایک کرب تھا۔ اور ہر آواز میں ایک شیون۔ ان کی آرزو آرزوئے مرگ رہ گئی تھی۔ اور ان کی زندگی کا سہارا موت کا انتظار تھا۔

یاس نے درد ہی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی
فانیٔ نا امید کو موت کا آسرا دیا

بلکہ یاس کی شدت کبھی اس قدر بڑھ جاتی کہ بعد مردن بھی سکون پانے کی امید جاتی رہتی۔

مرگ بے ہنگام فانی وجہ تسکیں ہو چکی
زندگی سے لوگ گھبراتے ہیں گھبرایا کریں

فانی کے نظریۂ حیات کا اثر اُن کی شاعری پر

خلیل الرب ایم۔ اے

فانی اردو کے ایک باکمال مگر بد نصیب شاعر تھے۔ انھیں فن شعر کا پختہ شعور تھا۔ ان کی شاعری میں وہ چمک دمک اور وہ خودگذاری و خود سپاری تو نہیں ملتی جو ان کے بعض ہم عصروں کے یہاں نظر آتی ہے۔ لیکن اس میں فنی خوبیوں کی کمی نہیں ہے۔ ان کی طرز ادا میں پرکاری اور اسالیب بیان میں تنوع ہے۔ ان کے یہاں گدازی بھی ملتی ہے اور کسی قدر گیرائی بھی، گدازی اس لئے کہ انہوں نے فکر اور جذبہ کا امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی اور گیرائی اس لئے کہ وہ خالص شاعری کے قائل تھے اور اس خارجی آب و رنگ یا شعریت کو ضروری خیال کرتے تھے جو شعر میں چستی، برجستگی، اور رنگینی پیدا کرے؛ جس میں ایک تعبیری حسن ہو، جو شعر سننے والے کو متاثر کر سکے۔ ان شاعرانہ محاسن کے باوجود فانی کی وہ قدر و منزلت نہ ہوئی اور انھیں وہ قبولیت عام میسر نہ آئی جس کا وہ اپنے کو مستحق سمجھتے رہے ہونگے فانی نے زندگی کو محض ایک دیوانہ کا خواب سمجھا اور اس سے

۱؎ اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

گریز کیا، زندگی نے ان سے انتقام لیا، مگر شاعری نے بھی ان سے وفا نہ کی، جس کا کہ فانیؔ نے زندگی میں سہارا لیا۔ فانیؔ کی اس ناکامیابی کا کیا راز ہے؟ آپ اس سوال کو کسی عنوان سے اٹھائیے۔ جواب صرف ایک ہے۔

فانیؔ کی اس ناکامیابی کا راز ان کے نظریۂ حیات میں مضمر ہے۔ فن کار کا زاویۂ نگاہ اور نظریۂ حیات اس کے فن کا اساس ہوتا ہے۔ اسی نظریہ میں جتنی ہمہ گیری اور جتنی وسعت اور بلندی ہوگی اسی قدر اس کی عظمت زیادہ ہوگی اور اس میں عالمگیر قبولیت اور اثر آفرینی کے امکانات زیادہ ہوں گے۔ آرٹ کی دنیا میں وہی فن کار ایک بڑے فن کار کا درجہ پائیگا جس نے زندگی کو پورے طور پر اور ہر ممکن رُخ سے دیکھنے کی کوشش کی ہو اور جس کی فنی تخلیق میں زندگی کی زیادہ سے زیادہ حقیقتوں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ جس میں زندگی کا ہر سایہ، ہر حرکت اور ہر رنگ نظر آئے اور جس میں ایک دیکھنے والی اور محسوس کرنے والی مخلوق کے دِل کی دھڑکن[۱] ہمیشہ سنائی دے۔

آرٹ کے اس بنیادی اصول کو سامنے رکھ کر فانیؔ کے

---

۱ یہ وہ دھڑکن ہے جسے فراقؔ نے اپنے مخصوص انداز میں "سناٹا نغمگیت" کہا ہے

کلام کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے نظریۂ حیات کے اثر سے جن موضوعات کو اپنی شاعری کا محور بنایا وہ نہایت محدود تھے اور زندگی کا کوئی زندہ اور وسیع تخیّل ہمارے سامنے پیش نہیں کرتے۔

فانی کے موضوعات شاعری کے سلسلے میں ہمارا ذہن سب سے پہلے ان کے محبوب ترین موضوع "غم" کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ شاعری میں رنج و غم کا بیان ہمیشہ مقبول رہا ہے' انسان ان نغموں[لہ] میں حلاوت محسوس کرتا ہے۔ جن میں گداز ہو' درد کی کسک ہو مگر غم گین نغمے کل زندگی نہیں ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ "دنیا میں انسان ہنستا کم اور روتا زیادہ ہے" اگر کوئی قہقہوں اور آنسوؤں کو ایک ترازو میں تولے تو آنسوؤں کا پلڑا بھاری رہے گا" یہ بیان زندگی کا نہ صرف یک رخہ نظریہ پیش کرتا ہے بلکہ ناقص بھی ہے۔ یہ بیان حقیقت سے قریب تر ہو جائے گا۔ اگر ہم یہ سمجھ لیں ؎

عالم ایجاد اک مجموعۂ اضداد ہے
اختلاف رنگ و بو سے انجمن آباد ہے (سیماب اکبر آبادی)

ہم اپنے رنج و خوشی کے پیمانے سے دُنیا کے رنج اور

لہ انگریزی کے مشہور شاعر شیلے کا کہنا ہے کہ ہمارے شیریں ترین نغمے وہ ہیں جو ہمیں غم کی یاد دلاتے ہیں۔

خوشی کو ناپتے ہیں" مگر فطرت[۱۵] گلشن اس قید سے آزاد ہے" انسانی زندگی میں غم اور خوشی اس طرح پیوست ہیں کہ ان کو علیحدہ پلڑوں میں رکھ کر تولا بھی نہیں جا سکتا۔ اس نوع کی تعلیم کا خیال ہمیشہ ان دماغوں میں پیدا ہوتا ہے جو خیالی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں اور عمل کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ جن کے نزدیک تخئیل سب کچھ ہے، تجربہ کچھ نہیں، جو زندگی کے جدلیات سے گریز کرتے ہیں۔

فانی کے فلسفۂ غم کے متعلق نقادوں نے طرح طرح کی نکتہ آفرینیاں کی ہیں۔ کوئی انھیں غم زدہ ازلی قرار دیتا ہے۔ کسی نے اسے شخصی ناکامیوں کا نتیجہ بتایا ہے، کوئی اسے موجودہ ماحول کی پیداوار بتاتا ہے جس میں[۵۲] احساس شکست اور غم بے حاصلی زیادہ ہے۔

کسی[۵۳] کے خیال میں جب شاعر کی انفرادیت زمانے کے آئین و قوانین کو، رسم و رواج کو، ماحول اور سماج کو اپنے بجھے ہوئے تیروں کا نشانہ نہیں بنا سکی تو وہ اپنی انفرادیت کے خلاف

---

۵۱ پورا شعر ہے۔

رکھ لئے ہیں نام پھولوں کے مختلف فطرت گلشن مگر اس قید سے آزاد ہے

۵۲ آل احمد سرور صاحب۔ ۵۳ کسی کا اشارہ پروفیسر احتشام حسین صاحب کی طرف ہے

علم بغاوت بلند کرتا ہے اور اس کا گلا گھونٹ کر تسکین حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اپنے ہی گریبان پر زور چلتا ہے۔ اور خواہش مرگ قوی تر ہو جاتی ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک غیر جانب دار نقاد کے دل پر کچھ وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ فانی کے حالات زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا وہ دور جو اثرات قبول کرنے کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے نہایت خوش حالی اور فارغ البالی کا تھا اور انھیں نکبت و افلاس کی وہ تلخیاں نہیں جھیلنا پڑیں جن کی بدولت زندگی پر تلخی یا جھلاہٹ پیدا ہو سکتی ہے انھیں ایک معقول آبائی ورثہ ملا جسے انھوں نے دونوں ہاتھوں سے لٹایا۔ یار باش آدمی تھے۔ جہاں رہتے جان محفل بنے رہتے، احباب کے جھمگٹے رہتے یا شعر و شاعری کی محفلیں اس طرح گرم رہتیں کہ اکثر اپنا کاروبار بھی بھول جاتے۔ لکھنؤ اور آگرہ کے زمانۂ قیام میں "رنگین صحبتوں" کا بھی شوق رہا۔ اس کے بعد متاہلانہ زندگی نہایت خوش گوار اور کامیاب گزری، مزاج میں حلم و مروّت کے ساتھ ساتھ خودنمائی اور خودداری بہت تھی، طبیعت میں تکلف اس قدر تھا کہ ملنے کے کمرے میں شیروانی پہنے بغیر نہ آتے تھے۔ جس شخص کی زندگی میں یہ حالات[۱]

---

[۱] یہ حالات ماہر القادری، بیکش اکبرآبادی، حکیم مختار احمد بدایونی، تابش دہلوی اور محمد سبطین بدایونی، وغیرہ کے مضامین میں ملتے ہیں۔

بھی ملتے ہوں۔ اور جس کی سیرت میں یہ خصوصیات بھی پائی جائیں اس کے منہ سے ہر لحظہ غم کا بیان اور خواہش مرگ کی تکرار سن کر قدرے حیرت ہوتی ہے یہ حیرت ہمیں میر کے سلسلہ میں نہیں ہوتی، اس لئے کہ ان کے اشعار پڑھ کر ہم جس قسم کی شخصیت کا تصور کر سکتے ہیں وہی میر کی شخصیت تھی۔ لیکن فانی کے بارے میں اس بیان میں ایک کمزوری ہے۔ ہم ظاہری حالات سے بطون کا قیاس کر سکتے ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ قیاس ہمیشہ درست ہو اور پھر انسان کی شخصی محرومیوں اور ناکامیوں کا صحیح اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ فانی کو ایسی ذہنی کشمکش اور شخصی ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا ہو جن کا دوسروں کو صحیح علم بھی نہ ہوا اور جنہوں نے فانی کے مزاج میں ایک سوگوارانہ کیفیت پیدا کر دی ہو لیکن یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر فانی کا غم ان کی ذاتی ناکامیوں اور محرومیوں کا نتیجہ تھا تو اس کا اثر ان کی شاعری کے آخری دور میں ملنا چاہیئے جب کہ وہ اس بات کا اندازہ لگا سکتے تھے کہ ان کی زندگی میں آنسوؤں کا پلڑا بھاری رہا یا قہقہوں کا لیکن فانی کے یہاں غم کے بیان کا ارتقا نہیں ملتا۔ عرفانیات فانی کی (جو کہ جدید اور قدیم کلام کے مکمل مجموعہ پر مشتمل ہے) پہلی غزل پر غم کا جو بیان ملتا ہے وہ قافیہ و ردیف کی تبدیلی کے ساتھ اکثر و بیشتر غزلوں میں آخری غزل تک پایا جاتا ہے۔ کلام کی اس

ہمواری اور یک رنگی کو دیکھ کر (کم از کم معنوی اعتبار سے) شبہ ہوتا ہے۔ کہ شاید ان کے تصوف کی طرح غم کا مضمون بھی عقل کا آفریدہ ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ میر کے اشعار ہمارے دل پر جس طرح چرکے لگاتے ہیں اور جس طرح ان کے لہجہ میں گداز اور درد کی کسک ملتی ہے وہ فانی کے یہاں مفقود ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی شاعری تمام تر بے اثر ہے۔ ان کے یہاں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں گداز بھی ہے اور چھپی ہوئی نشتریت اور اثر آفرینی بھی، مگر ایسے اشعار کی تعداد کم ہے، ان کم تعداد اشعار کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبض کائنات
جب مزاج یار کچھ برہم نظر آیا مجھے

عشق کی وہ لطافتیں، حسن کی وہ نزاکتیں
ہائے وہ زندگی جو اب خواب خیال ہو گئی،

آج ہم پی سکے نہ وہ آنسو ؛ ان کے آگے جو بار بار آیا

اک فسانہ سن گئے ، اک کہہ گئے
میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے

اللہ رے سکونِ قلب اس کا جس نے دل لاکھوں توڑ دیئے
جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی

نہ تو سماج کا دکھ درد ملتا ہے اور نہ" اس کی ہڈیوں کے

چٹخنے کی آواز سنائی دیتی ہے"۔ ان کا غم انفرادی ہے اور شاعری میں جس آرٹ کے قائل تھے اس میں سماج کے دکھ درد کے بیان کا زیادہ امکان بھی نہ تھا۔ "زندگی[۵۱] کب موت بنتی ہے اور موت کب زندگی"۔ یہ آپ کو مزدور کی زندگی میں بھلے ہی مل جائے مگر فانی کی شاعری میں اس کی تلاش کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ غالب کی شاعری میں سیاسی بیداری کی۔ گنتی کے چند اشعار اور کشمیر پر تین رباعیوں کے علاوہ ہم کو کہیں بھی فانی کی شاعری میں "اس[۵۲] ماحول کا عکس نہیں ملتا جس میں احساس شکست اور غم بے حاصلی زیادہ ہے، جس میں اچھی باتیں ملتی ہیں اور اہل ہنر پریشان رہتے ہیں" اور واقعہ یہ ہے کہ ایک ایسے شاعر سے جو شعر کو شعر کا مقصد سمجھتا ہو اور اسے غایتی بنانے پر کسی طرح تیار نہ ہو ہم سماج کی شعوری عکاسی کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتے۔ آرٹ اور شعر و ادب میں سماج کی شعوری عکاسی کے سلسلہ میں ایک اہم نکتہ قابل غور ہے۔ دوستوں کی سرد مہری، فلک کی ستم رانی اور زمانہ کی قدر ناشناسی اردو شاعری کے ایسے موضوع ہیں جن پر ہر اردو شاعر نے طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان موضوعات پر جس نوع کے اشعار ملتے ہیں اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ

۵۱، ۵۲ یہ جملے آل احمد سرور کے مضمون "اردو شاعری میں فانی کی قدر و قیمت" سے ماخوذ ہیں۔

سب روایتی اشعار ہیں جنھیں محسوس کرکے نہیں کہا گیا اور پھر اساتذۂ قدیم کے یہاں تو ایسے اشعار کے لئے ایک جواز بھی ہے۔ لیکن دَورِ حاضر میں اس قسم کے اشعار کی حیثیت محض روایتی ہے۔ میر وسودا کا زمانہ یقیناً پریشان حالی اور آشفتہ سامانی کا تھا۔ وہ زمانہ ضرور ایسا تھا کہ انفرادی سکون اور اجتماعی چین دونوں مفقود تھے۔ ایک پورا معاشرتی اور سیاسی نظام درہم برہم ہو رہا تھا۔ مگر نئے نظام کے جنم لینے کے آثار پیدا نہ تھے۔ وہ دَور احساسِ شکست اور غمِ بے حاصلی کا تھا۔ آج اگر کوئی شخص سودا کے ابلق روزگار اور موجودہ زمانہ میں فرق نہیں محسوس کرتا تو وہ نئی قدروں سے عدمِ آگہی کا ثبوت دیتا ہے۔ آج زمانہ کے یہ تیور ہیں کہ موسے ہیں شاہیں سے ٹکرانے کا عزم وحوصلہ پیدا ہے۔ اس دَور کی شاعری اپنے عہد کی نہایت ناقص ترجمانی کرے گی۔ اگر وہ محض یہ بیان کرے کہ مزدور کی زندگی میں زندگی کب موت بنتی ہے اور موت کب زندگی؟ اگر اس کی نگاہ صرف دوزخ[۵۱] میں سموئی ہوئی جنّت تک پہنچے اور یہ دیکھنے سے قاصر رہے کہ انسانی عزم وحوصلہ اور جد وجہد کس طرح اس دوزخ میں سموئی ہوئی جنّت کو سراپا جنّت بنانے کی فکر میں ہے

۵۱؎ پھولوں کی نظر نواز رنگت دیکھی   مخلوق کی دل گداز حالت دیکھی
قدرت کا کرشمہ نظر آیا کشمیر   دوزخ میں سمائی ہوئی جنّت دیکھی

ہے۔ دورِ حاضر کا شاعر یا ادیب اگر اپنی فنی تخلیق میں عصریت کی صحیح روح پھونکنا چاہتا ہے تو اسے محض ذہنی، مادی اور سیاسی کشمکش اور خلفشار کے بیان سے اکتفا نہ کرکے ان زبردست قوتوں اور محرکات کا بھی جائزہ لینا چاہیئے جو سماج کی زیریں سطح میں پوری شدومد سے مصروف کار ہیں اور جن سے اک نئی دُنیا کی تعمیر ہو رہی ہے اور جن کی بدولت زندگی کی نئی معاشرتی قدریں اور نظریات پختہ اور مستحکم ہو رہے ہیں۔

فانیؔ کے کلام میں غم کا موضوع کس راہ سے آیا یہ ایک دلچسپ سوال ہے، لیکن اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ فانیؔ کے غم کی نوعیت کیا ہے؟ غم کے مواقع پر غمگین ہونا یا غم میں آنسو بہانا ایک فطری بات ہے اسی طرح یہ بھی غیر فانی بات نہیں کہ انسان ضبطِ غم کا حوصلہ پیدا کرے اور بڑے سے بڑے صدمے کو دل پر سہہ لے اور زبان سے اُف تک نہ کرے۔ لیکن غمِ جاوداں[1] کے نہ ملنے کے غم میں گھلنا اور غم میں نشاط کے تمام پہلو تلاش کرنا خلافِ فطرت ذہنیت ہے جسے ہم ایک نفسیاتی بیماری سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اسی ساکیت کا اثر تھا کہ فانیؔ خوشی میں بھی غم کے پہلو کرید کرید کر نکالتے تھے ؎

غم عین نشاط در از تخلیقِ نشاط ؛ غم جنتِ انبساط و تصدیقِ نشاط
غم کا ہے تبسم جسے کہتے ہیں وجود ؛ ہستی کو ہے غم کے دم سے توفیقِ نشاط

---

[1] وہ بدگماں کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں ؛ مجھے یہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا

یہ بیمار ذہنیت جتنی خطرناک ہے اتنی ہی ناپسندیدہ اور ناقابلِ قبول بھی، جس طرح زندہ رہنے کی خواہش ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لمحاتِ غم کو حاصلِ حیات تصور کرنا فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔ شاید اسی لئے انسان غم کے لمحات کو جلد سے جلد فراموش کرنا چاہتا ہے اور خوشی کے لمحات کو غم کی یاد میں غمگین بنانا گوارا نہیں کرتا۔ اس مسلمہ حقیقت کے خلاف جو مثالیں ملتی ہیں ان کی حیثیت مستثنیات کی ہے۔

غم کی طرح "یاس" کی بھی فانی کے یہاں بے حد فراوانی ہے۔ یاس کا جذبہ (اگر اسے جذبہ کہنا درست ہو) روحِ رواں کی طرح ان کے کلام میں جاری و ساری ہے۔ ان کو اپنی بدنصیبی و محرومی پر یقینِ کامل تھا۔ امید و حوصلہ کی کوئی رمق ان کے کلام میں نہیں ملتی۔ جذبات کا فقدان یاس کی کیفیت پیدا کرتا ہے جو جذبۂ غم سے زیادہ مضرت رساں ہے۔ خوشی کی طرح غم کا بھی ایک اثباتی پہلو ہے۔ مگر یاس ایک منفی کیفیت ہے۔ یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دل میں کوئی ولولہ، کوئی امنگ، کوئی خواہش اور کوئی امید باقی نہ رہ جائے۔ زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب انسان پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی ورنہ زندگی اور موت میں کوئی فرق

نہ رہ جائے۔ دُنیا کی رنگا رنگی جذبات سے عبارت ہے۔ جذبات
کے فقدان سے یاس کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا منتہی ہو جانا
شخصی اور اجتماعی زندگی کے لئے یکساں طور پر ہلاکت آفریں ہے

فانی میں یاس کی یہ شدت کچھ تو ان کی قنوطی طبیعت کا
اثر ہے اور کچھ عجمی تصوف کا۔ عمل اور جد وجہد میں ناکامی کی
صورت میں یاس اور ناامیدی کا احساس فطری ہے مگر ہر ناکامی
ایک بلند حوصلہ انسان کے حق میں مزید کوشش کے لئے ایک تازیانہ
ہے۔ اقبال نے اسی لئے زندگی کو جہدِ مسلسل کہا ہے۔ اس جہد
میں جو لوگ کھپ جاتے ہیں وہ دوسروں کے لئے راستہ ہموار
کر جاتے ہیں۔ فانی کے یہاں عمل اور جد وجہد کی مثالیں نہیں ملتیں
ان کے کلام میں شدتِ یاس کی یہی توجیہہ ہو سکتی ہے کہ ان کو محرومی
و نامرادی پر اس درجہ یقین راسخ تھا کہ ان میں کبھی حوصلۂ عمل پیدا ہی
نہ ہوا اور یاس کی کیفیت ان کے دل و دماغ کے ساتھ ساتھ ساری
شاعری پر مستولی ہو گئی۔ دوسرا اثر عجمی تصوف کا ہے عجمی تصوف کا مسئلہ جبر[۹۵]

---

۹۵ [illegible] ص ۵۲ "جبر و اختیار" اسلامی علمِ کلام کی
اصطلاحات ہیں۔ اگر ہم کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جبر بھی عین عدلِ
خداوندی ہے۔ مگر فانی کی نظر اس مسئلے کے تاریک پہلو پر پڑی اس لئے ان
کے یہاں جبر کا مفہوم انسان کی مجبوری محض ہے۔ صحیح اسلامی عقیدہ ما بین جبر و
اختیار ہے۔

فانی کے قنوطی مزاج کو بے حد راس آیا۔ عجمی تصوف نے قومی زندگیاں تباہ کی ہیں۔ انھیں سرد اور بے عمل بنایا ہے۔ زندگی سے فرار کی راہ دکھائی ہے۔ پھر اس تصوف کا فانی کے کلام کو بے ذوق اور فسردہ بنا دینا تو ایک معمولی سی بات تھی، جیسا کہ اُدھر کسی جگہ ذکر آیا ہے۔ فانی کے یہاں ایسے اشعار ہیں جن کا گداز ہمارے دلوں میں کسک پیدا کرتا ہے۔ لیکن ان کی شاعری کی عام فضا روایتی، سرد اور حوصلہ شکن ہے۔ اس میں اس ہمت عالی کی تلقین نہیں ملتی جو دریا بھی قبول نہ کرے"۔ وہ عمل افروز اور حیات افزا جذبہ نہیں ملتا جس کا زمانہ مقتضی ہے اور جس کی گونج ہم اقبال کے یہاں پاتے ہیں۔[1]

غم و یاس کی طرح موت بھی فانی کی شاعری کا ایک مستقل اور محبوب موضوع ہے۔ اردو کے کسی شاعر نے موت کو اپنی شاعری میں مستقل موضوع کی حیثیت نہیں دی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اردو شعراء نے اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا۔ موت چونکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اس لئے ہر شاعر نے اس کے متعلق اشعار کہے ہیں۔ لیکن غالب، چکبست، اصغر اور اقبال کو چھوڑ کر دیگر

---

[1] اقبال نے اپنے اس شعر میں غالباً فانی ہی کی شاعری کی طرف اشارہ کیا ہے
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق ؎ افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار

شعرا کے یہاں بالعموم مفکرانہ اندازِ فکر مفقود ہے۔ موت کا بیان ہمارے یہاں زیادہ تر دو طرح سے ملتا ہے۔ ایک تو شعراء ہجرِ یار میں روز مرتے تھے۔ دوسرے موت کے بیان سے دوسروں کو عبرت دلانا مقصود ہوتا تھا۔ مگر فانی نے اس سلسلہ میں ایک انفرادی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر بہت لکھا ہے اور مختلف پیرایوں سے لکھا ہے۔ لیکن چونکہ اظہارِ خیال متفرق اشعار میں کیا گیا ہے اس لئے ان کے یہاں وہ بلندیِ فکر اور وہ تسلسل خیال نہیں ہے جو اسی موضوع پر انگریزی نظموں میں نظر آتا ہے۔ تاہم ان کے اشعار میں تفکر کا انداز ضرور ملتا ہے۔ فانی نے موت کو حسین بنانے کی کوشش کی تھی۔ اسے نامرادوں کی مراد اور علاج دردِ زیست کہا ہے۔ فانی کے حق میں ممکن ہے یہ سب کچھ ٹھیک ہو ان کی غم نصیب اور تھکی ہاری زندگی ممکن ہے صرف موت[1] کی آغوش میں سکون کی متلاشی ہو مگر ہم اسے زندگی کا صحت مند نظریہ کبھی نہیں کہہ سکتے۔ حیات اپنی تمام محرومیوں اور مجبوریوں کے باوجود نہایت عزیز شے ہے اور موت ایک خوفناک حقیقت۔ ہم زیادہ سے زیادہ موت کے

---

[1] لیکن یہ واضح رہے کہ وہ اس سکون کے متلاشی اس وقت سے تھے جب سے شعر کہنا شروع کیا تھا اور اس وقت ان کی زندگی غم نصیب نہ تھی۔

خیال سے بے اعتنائی برت سکتے ہیں۔ ہمارا یہ انداز ہو سکتا ہے کہ جب تک جیتے ہیں جیتے ہیں، جب وقت آجائے گا تو چل بسیں گے۔ مگر انسان کے پہلو میں جب تک ایک دھڑکتا ہوا دل ہے جو اسے سود و زیاں کا احساس دلاتا ہے اور جس کی بدولت دنیا کے آب و گل سے اس کی وابستگی ہے۔ وہ موت کو حسین نہیں سمجھ سکتا اور اس کی تمنا میں نہیں مر سکتا۔ فانیؔ کے دماغ پر موت کا خیال ایک " complex " کی طرح مسلط تھا۔ وہ زندگی کے ہر لحظہ کو موت سمجھتے تھے۔ اور ہر گھڑی انھیں موت کا انتظار تھا؎

ہر گھڑی عمر گذشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

بجھتی ہی نہیں شمع جلے جاتی ہے ؛ کٹتی ہی نہیں رات ڈھلے جاتی ہے
جاری ہے نفس کی آمد و شد فانیؔ ؛ سینے میں چھری ہے کہ چلے جاتی ہے

اب سوال یہ ہے کہ فانیؔ واقعتہً موت کو اتنا ہی حسین اور عزیز سمجھتے تھے جتنا کہ ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ علی گڑھ میگزین کے فانی نمبر میں ماہر القادری صاحب کا ایک مضمون ہے۔ اس میں

؎ جوش نے اسی چیز پہ سخت چوٹ کی ہے۔

دامن کو ہمیشہ نم کیا کرتا ہے ؛ دریا تری آنکھوں سے بہا کرتا ہے
یک مشت اجل کو جان دینا بہتر ؛ مرتا ہے باقساط یہ کیا کرتا ہے

فانی کی شخصیت اور سیرت کے چند پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے ان کا بیان ہے "بیماری کے زمانہ میں ایک دن میں اور نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج (پنشنر کلکٹر) فانی کے یہاں گئے۔ مزاج پرسی کے بعد فانی سے نواب صاحب نے کہا" فانی تم مر نہیں سکتے، تمہاری انرجی (قوت) ضائع نہیں ہوئی۔ وہی فانی جو ہمیشہ مرگ ناگہاں کی تمنا کرتا تھا ان لفظوں کو سُن کر اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ زندگی کتنی عزیز شے ہے!" اگر اس بیان میں صداقت ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اسے صحیح نہ سمجھا جائے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ فانی کی خواہش مرگ میں صداقت کا وہ درجہ نہ تھا جس کے بارے میں نقادوں نے صفحے کے صفحے رنگ ڈالے ہیں۔

فانی کی خواہش مرگ میں کتنی صداقت تھی، وہ موت کو کتنا حسین سمجھتے تھے ان بحثوں سے قطع نظر یہ ایک حقیقت ہے کہ فانی

---

۱۱۵ موت کی خواہش اور زندگی سے بے زاری کی جو شدت فانی کے یہاں نظر آتی ہے اس کے لحاظ سے تو فانی کو یہ سن کر اور بھی غمگین ہو جانا چاہیئے تھا کہ وہ ابھی مر نہیں سکتے۔ نفسیات کے ایک بہت بڑے ماہر سگمنڈ فرائڈ نے ایک چبھتی ہوئی بات کہی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اکثر ہم اس چیز سے اپنی سخت نفرت اور بے زاری کا اظہار کرتے ہیں جس کے لئے ہمارے دل میں ایک دبی ہوئی خواہش ہوتی ہے۔

نے جس انداز میں اس موضوع کو پیش کیا ہے وہ انتہائی غیر فطری ہے۔ موت کے مضمون کی کثرت نے ان کی شاعری کو اس درجہ سوگوارانہ رنگ دے دیا ہے کہ جو کبھی مقبول اور پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔

حیات و ممات کے متعدد ایسے مسائل ہیں جنھوں نے فلسفہ، سائنس اور مذہب کو یکساں طور پر اپنی طرف متوجہ کیا ہے شعراء نے بھی ان مسائل کی طرف توجہ کی ہے۔ مگر ان مسائل کی حیثیت کبھی نہ حل ہونے والے معمہ کی ہے۔ ان مسائل پر جن مختلف زاویوں سے بحثیں ہوئی ہیں ان کی تفصیلات میں پڑنا نہ تو ہمارا موضوع ہے اور نہ اس مختصر مقالہ میں اس کی گنجائش ہمارے مقصد کے لئے صرف اتنا ذہن نشین کر لینا کافی ہوگا کہ زندگی کی ارتقائی نوعیت چاہے ایک مسلمہ حقیقت ہو یا نہ ہو لیکن اس کے جدلیاتی تنوع پر خود ہمارا مشاہدہ شاہد ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خوشی اور رنج، یاس و امید، نور و ظلمت، صلح و جنگ اور اسی طرح ضدّین کے بے شمار جوڑے آپس میں ٹکرا ٹکرا کر زندگی کے دھارے کو آگے بہائے لئے جا رہے ہیں۔ یہ ڈرامہ نہ جانے کب سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ پھر یہ تذکرہ تو اس ڈرامہ کا ہے جو ہم اپنی دنیا میں دیکھ رہے ہیں ہماری دنیا سے باہر کائنات کی بسیط اور لاانتہا فضاؤں میں

کیا ڈرامے ہو رہے ہیں ان کا اندازہ کون لگائے۔

زندگی کے اس ڈرامے میں ہم ایک لمحہ کے لئے پردہ پر آتے ہیں۔ اس فرصت یکسر کو کس طرح برتا جائے؟ ہم اس ڈرامہ کے (جس میں طربیہ اور المیہ کا ناقابل تقسیم امتزاج ہے) خاموش تماشائی تو بن نہیں سکتے اس لئے کہ یہ تو آئینِ فطرت کے خلاف ہے۔ ہم حصّہ لینے پر مجبور ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس لمحۂ فرصت کو محض اس اتفاق یا واقعہ پہ آنسو بہانے میں صرف کر دیں کہ پردہ پہ لائے کیوں گئے۔ یا ہنسی خوشی اس میں شریک ہو کر اسے اپنی بساط بھر "خوب[1] سے خوب تر" بنانے کی کوشش کریں

یہ خیال کہ انسان مجبور محض ہے اور قدرت کی اندھی مشین اسے پیسنے پہ تلی ہوئی ہے عجمی تصوف کا اثر ہے جس کی بنیاد حقائقِ زندگی سے گریز پر قائم ہے۔ یہ خیال شکست خوردہ ذہنیت سے پیدا ہوتا ہے۔ اور دوسروں کو شکستہ پر بناتا ہے۔ اسی عجمی نے سے فانیؔ کی شاعری کا خمیر تیار ہوا ہے۔ یہ لَے زندگی کو صرف بے رنگ ہی نہیں بناتی۔ بلکہ انسان سے زندگی کا سارا حوصلہ چھین لیتی ہے۔ ان اشعار کو پڑھیئے اور دیکھئے کہ ان کے اثرات کتنے حوصلہ شکن ہیں۔

---

[1] ہر نگارے کہ مرا پیش نظر می آید ؛ خوش نگارے است ولے خوش تر ازاں می باید

نامرادی حد سے گذری حال فانیؔ کچھ نہ پوچھ
ہر نفس ہے اک جنازہ آہِ بے تاثیر کا

ہے موت ہی اب زندگیٔ دل کا سہارا
جینے کی جو ایسی ہی تمنا ہے تو مر جا

یہ زندگی کی ہے رودادِ مختصر فانیؔ
وجودِ دردِ مسلّم علاج نامعلوم

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

میں کہاں اور کہاں عمرِ دو روزہ فانیؔ
زندگی اب یہ تقاضائے گراں جانی ہے

پھر اگر یہ خیال یا نظریہ تصوّف کے دیگر مسائل کی طرح محض "برائے شعر گفتن خوب است" تک محدود رہے تو زیادہ ہرج نہیں لیکن شاعر کی اس ذہنیت یا نظریہ کا قومی اور اجتماعی زندگی میں سرایت کر جانا انتہائی ہلاکت آفریں ہے۔ اقبالؔ اس عجمی نَے کی زہر آگینی سے آگاہ تھے وہ اس رمز سے واقف تھے کہ صوفی[۱۵]، فقیہ، اور شاعر تینوں نے مل کر کتنے سفینے ڈبوئے ہیں اقبالؔ کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے قومی زندگی کو اس زہر آگینی سے بچانے کی کوشش کی اور اس میں ایک نئی روح، ایک

---

۱۵ خبر نہیں کہ سفینے ڈبو چکی کتنے / فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

نئی تڑپ اور زندگی کا ایک نیا حوصلہ پیدا کیا۔
فانی کا ایک شعر ہے۔

اب نئے سُر سے چھیڑ پردۂ ساز ۔ میں ہی تھا اک شکست کی آواز

معلوم ہوتا ہے کہ فانی نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ان کا ساز نہ تو وقت کا ساز ہے اور نہ وہ ساز ہے جسے کاروان حیات کے لئے بانگ درا کہہ سکیں، زمانہ کو جس ساز کی ضرورت تھی وہ ساز اقبال کے پاس تھا۔ اب اقبال کے بعد والے دور میں اس ساز کی کیا لے ہوگی اس پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

غم و یاس، خواہش مرگ اور انسان کی مجبوری محض فانی کی شاعری اور شاعری کیا ان کی زندگی کے سنگ بنیاد ہیں۔ اس بنیاد پر جس زندگی کی تعمیر ہوگی۔ ظاہر ہے کہ وہ مدعائے حیات سے محروم ہوگی۔ مدعائے حیات سے محرومی اور پھر ہمہ وقت اس کا احساس ہمارے تخیل حیات کو کتنا تنگ، کتنا محدود اور کتنا بے رنگ و آہنگ بنا دیتا ہے۔

یہ کاروان حیات کس منزل کی طرف رواں دواں ہے اور کہاں جاکر دم لے گا۔ ان سوالوں کا جواب دینا تو آسان کام نہیں ہاں اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ انسان اپنی تمام کوتاہیوں تمام کمزوریوں اور تمام محرومیوں کے باوجود آگے بڑھ رہا ہے

وہ دیکھتا ہے کہ یہ زندگی خواب نہیں بلکہ ایک عینی حقیقت ہے۔ لیکن فانی کے نظریۂ حیات کا نقطۂ عروج دوسری انتہا پر جا کر رُکا۔ یہاں زندگی محض خواب ہے اور بے مدعا و بے مقصد۔ اگر فانی کا یہ خیال صحیح ہے، تو پھر اقبال کا یہ شعر کیا معنی رکھتا ہے۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

زندگی کو بے مدعا اور بے مقصد قرار دینے والی شاعری اور اس عمل افروز اور حیات افزا شاعری میں جو آدم خاکی میں مہ کامل سے بھی روشن تر بن جانے کا حوصلہ پیدا کرے انتخاب کرنا زمانہ کے لئے زیادہ دشوار نہ ہوگا۔ قرائن بتا رہے ہیں کہ زمانے کا تناظر جیسے جیسے دور ہوتا جائے گا موخرالذکر شاعری کی مقبولیت اور اہمیت جس رفتار سے بڑھے گی اول الذکر شاعری اسی رفتار سے پس پشت پڑتی جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ یہ نظریۂ حیات صرف فانی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ دُنیا میں ایسے بہت سے روحانی پیشوا اور فلاسفر گذرے ہیں جنہوں نے دُنیا کو غم کدہ تصور کیا ہے۔ اور اس تنگ و تاریک غم کدہ سے فرار کی راہ دکھائی ہے۔ لیکن

سلہ مری حیات ہے محروم مدعائے حیات! وہ رہگذر ہوں جسے کوئی نقش پا نہ ملا

ان کے خیالات کا اثر ہمیشہ محدود اور وقتی رہا ہے۔ دُنیا کی برگزیدہ ترین ہستیاں وہی شمار کی جاتی ہیں۔ اور انھیں کے پیغامات کو ابدی قبولیت اور عالمگیریت حاصل ہوئی ہے۔ جنھوں نے انسان کی روحانی اور مادی خوشیوں میں اضافہ کیا ہے۔ اور ان کی ترقی کے لئے نئی راہیں سجھائی ہیں۔ زندگی کو بے مقصد اور بے مدّعا سمجھ کر اور دُنیا کو غم کدہ تصور کر کے اس کے ہنگاموں اور محشر سامانیوں سے گریز انسانی فطرت کے منافی ہے۔ جس دن انسان انسان نہ رہ جائے گا اور اس کا دھڑکتا ہوا دِل خاموش ہو جائے گا اس دن شاید دنیا محض غم کدہ بن جائے۔ اور اس کی زندگی بے مقصد اور بے مدّعا۔
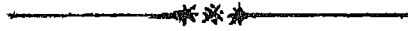
فانی کی شاعری کا ایک روشن پہلو

خواجہ احمد فاروقی۔ ایم۔ اے

محب مکرم ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی جنھوں نے فانی کو بہت قریب سے دیکھا تھا ایک صحبت میں فرماتے تھے۔ "فانی کی ابتدائی زندگی بڑی امیرانہ شان سے گذری تھی" زہرہ صبح بھی تھا اور جام بلور بھی۔ گھر کا سارا اندوختہ ختم کر دیا تھا، لیکن خودداری کا یہ عالم تھا کہ اپنے بے تکلف دوستوں سے بھی اپنی پریشان حالی کا ذکر نہ کرتے تھے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد ان سے غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے۔ اور طرح طرح کے بہانوں سے ان کو حیدرآباد بلاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص کے ہاتھ سفر خرچ بھیجا۔ اور کہلوایا کہ میری زندگی اب زیادہ نہیں رہی ہے دنیا سے صرف ایک حسرت لئے جا رہا ہوں کہ فانی کی صحبتوں سے محروم رہا۔ پایان عمر میں اگر یہ خواہش پوری ہو جاتی تو موت اتنی گراں بار نہ ہوتی، میں، لطیف اور غالباً منصور، فانی کے پاس موجود تھے انھیں دھکے دے کر حیدرآباد سوار کروایا۔ مہاراجہ نے بڑی دلداری کی۔ ایک خوبصورت اور سجا سجایا مکان رہنے کے لئے دیا۔ اور ایک موٹر یہ کہہ کر دی کہ میں تو کہیں آنے جانے

کے قابل رہا نہیں۔ میرے مکان سے آپ کی قیام گاہ کا کافی فاصلہ ہے۔ جب مزاج چاہے اس میں تشریف لائیے گا۔ فانی نے کچھ دنوں کے بعد وطن جانے کی اجازت چاہی۔ مہاراجہ نے فرمایا "مجھے اس حال میں چھوڑ کر کہاں جائیے گا" پھر یہ خیال کر کے کہ فانی کو یہ ملال نہ ہو کہ کچھ کام وام تو ہے نہیں، خواہ مخواہ روٹیوں پر پڑا ہوں، ان کو ایک شہزادے کا اتالیق مقرر کروا دیا۔ وہ ایک دن آئے اور کہنے لگے :-

"قبلہ آپ کی عنایتوں نے مجھے گستاخ بنا دیا ہے۔ میرے مزاج کی وارستگی آپ کو معلوم ہے وہاں کی پابندی اور القاب و آداب میرے بس کے نہیں" اس کے بعد وہ کسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ لیکن لڑکوں کا شور وغل بھی ان کے بس کا نہیں تھا۔ مہاراجہ کے انتقال کے بعد کوئی اتنی بات ان سے پوچھنے والا بھی نہیں رہا اور آخری زمانہ انہوں نے سخت تکلیف، پریشانی اور ناخوشی کے عالم میں گذارا۔

حیدرآباد جس کی داد و دہش فیض سحر کی طرح عام ہے اس کی قدر شناسی کی تاریخ میں یہ عجیب و غریب واقعہ ہے کہ فانی نے اپنا تمام وقت آغوش غم اور پہلوئے حرماں ہی میں گذارا اور اس کی آرزوئیں بقدر خواہش دل پوری نہ ہو سکیں۔ ذیل کے اشعار ان کی حیدرآباد کی زندگی کا مرقع ہیں:-

دل کے سوا یہاں کوئی محرمِ دردِ دل نہیں
بے خبروں سے کیوں کہیں اہلِ خبر سے کیا کہیں
حُسن جفا پسند سے، حسرت عرضِ شوق کیا
تشنہ لبی کا ماجرا آب گہر سے کیا کہیں

وعدوں پہ ہیں کیوں ناحق امید کی تاکیدیں
بندھتی ہیں کہیں ظالم ٹوٹی ہوئی امیدیں
یہ فیضِ محبت ہے، اقبالِ محبت ہے
ہر آہ کو حاصل ہیں تاثیر کی تائیدیں
آغازِ محبت کے اللہ وہ کیا دن تھے
وہ شوق کے ہنگامے وہ شوق کی تمہیدیں

فانی کے اس نامۂ منظوم سے جو انھوں نے مہاراجہ کشن پرشاد کے نام لکھا تھا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ آخر زمانہ میں انھوں نے بھی تغافل اور بیگانگی سی اختیار کر لی تھی[۱]۔ اور نا ندیڑ کے تبادلہ کو فانی عتاب سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ غرض اس میں شک نہیں کہ ان کی زندگی بڑی نامرادانہ گزری "او این چنیں بزیست کہ گویا غدا نداشت"

۱۔ کلیات فانی ۔ ص ۳۵۵

فانیؔ کی ابتدائی زندگی بڑی رنگین اور مسرفانہ تھی۔ ان کے عشق کی ناکامی بھی تقریباً مسلم ہے۔ اور ان کے آخری دَور کی پریشانیاں بھی مانی ہوئی حقیقت۔ غمِ عشق اور غمِ روزگار نے مل کر ان کے دل کو آتش کدہ بنا دیا تھا۔ اسی آگ کے شعلے زبانِ شعر سے نکلے ہیں۔ ان کی شاعری کا عنصر غالب غم و اندوہ ہے۔ لیکن یہ غم روایت نہیں، صداقت ہے۔ انھوں نے اسی آگ میں تپ کر اس کو گلزار بنا یا ہے اور موت کو زندگی سے بھی زیادہ خوشنما لباس پہنا یا ہے۔ یہ دلکشی — یہ زیبائی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب غم کا مفہوم وسیع ہو جائے۔ جب شاعر یہ کہہ سکے:-

ع۔ دُنیا سمٹ آئی ہے مرے دیدۂ تر میں (فانیؔ)

یا ؎ یوں تو کچھ غم سے سروکار نہ راحت کی تلاش
غم کوئی دِل کے عوض دے تو خریدار ہیں ہم (فانی)

جب مسرت و الم کے سطحی امتیازات اٹھ جائیں، جب غمِ جاناں اور غمِ دوراں میں فرق نہ رہے بقول عرفیؔ ؎

دَر دلِ ما غمِ دُنیا غمِ معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

فانیؔ کے یہاں یہ احساس اپنی پوری درخشانی کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن اس کو اتنی مرتبہ یاسیات کا امام یا بیوہ عالم اور

سوز خواں کہا گیا ہے کہ اس کی شاعری کے بہت سے تابناک حصے اس تنقید کی ظلمت میں چھپ کر رہ گئے ہیں۔ لیکن اگر تنقیدوں کے بجائے خود اس کی پوری زندگی اور شاعری کو سامنے رکھا جائے تو یقین ہے کہ اس کی نوا اس درجہ مُردہ اور افسردہ اور اس کا کلام اتنا بے کیف اور بے جان نظر نہیں آئے گا۔ جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔

فانی کی شاعری نے اس وقت آنکھ کھولی جب لکھنؤ اور دہلی اسکول کی حدیں ٹوٹ چکی تھیں۔ لکھنؤ کی زبان، دہلی کے حسن معانی سے ہم کنار ہو چکی تھی۔ تخلیق معانی، صنعت گری سے زیادہ اہم سمجھی جاتی تھی۔ غزل اور مرثیہ کی شاندار روایات موجود تھیں۔ لیکن اس پیکر میں کوئی نئی روح پھونکنے والا موجود نہیں تھا کچھ روایتی غزل گو شعراء نے الفاظ سے اشعار کے گلدستے بنائے تھے۔ لیکن رنگ و نکہت کے سراب نے ان کو شادابی اور طراوت سے محروم رکھا تھا۔ فانی نے اپنے دل کی گلابی سے ان الفاظ و معانی کو نئے رنگ میں رنگ دیا۔ وہ زخم دل کے بھر جانے سے ڈرتا ہے، وہ بغیر مرگ زیست کے لئے آمادہ نہیں۔ اسے یہ غم ہے کہ غم جاوداں نہیں ملتا۔ وہ بقیہ چاک گریباں، وحشت روا نہیں رکھتا۔ در و دیوار کے ساتھ وہ ویرانی ضروری سمجھتا ہے، جنون سے بھی اسے آزادی کی توقع

نہیں وہ آہِ جگر گداز اور نالۂ دلِ خراش کو حاصلِ زندگی سمجھتا ہے آرزوئے مرگ اُسے مرنے نہیں دیتی۔ بے خلشِ مدعا اسے لطفِ حیات نہیں ملتا، اس کے نزدیک دردِ لاعلاج محبت ہی دوا ہے اور داغِ دلِ نقشِ مدعا ـــــ یہ وہ منزل ہے جب درد "روحانی" بن جاتا ہے اور آرٹ اپنے بلند ترین مقام پر فائز ہوتا ہے۔

بعض نقادوں نے فانی کی گریہ و زاری، اور جذبہ الم کی بے کیف یک رنگی و فراوانی پر اعتراض کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غم کا جذبہ اس کے کلام پر چھایا ہوا ہے۔ لیکن وہ بے کس عورتوں کی طرح ٹھہک ٹھہک کر نہیں روتا۔ اس کی موت زندگی سے زیادہ دلکش ہے، اور اس کا غم تبسم گل سے زیادہ پائدار اور دل آویز۔

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا

زندگی سے ہو بیزار فانی اس سے کیا حاصل
موت کو منالو گے جان سے خفا ہو کر

مری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

اللہ رے نوکِ نشترِ غم کی لگاوٹیں
اک اک لہو کی بوند پہ ظالم مچل گئی

اس میں شک نہیں کہ فانی نے وہی قفس و آشیاں شمع و پروانہ

ہجر و وصال، بہار و خزاں، اور زندان و صحرا کے مضامین پر خامہ فرسائی کی ہے۔ لیکن اس زمانہ میں کم شاعر ہیں جنہوں نے ان مفروضات و علامات کو اتنی صحت و صداقت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اور غالباً اس سے بھی کم شاعر ہیں جنہوں نے ان کی اتنی توجیہات پیش کی ہیں:-

کل تک یہی گلشن تھا، صیاد بھی بجلی بھی
دُنیا ہی بدل دی ہے تعمیر نشیمن نے

ہاں ناخن غم کمی نہ کرنا
ڈرتا ہوں کہ زخم دل نہ بھر جائے

بہار آئی کہ یارب عید آئی اہل زنداں کو
گریباں نے گلے لپٹا لیا ہے بڑھ کے داماں کو

بے ذوق نظر بزم تماشا نہ رہے گی
منہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

بجلیاں شاخ نشیمن پہ بجھی جاتی ہیں
کیا نشیمن سے کوئی سوختہ ساماں نکلا

اپنے کمال شوق پر حشر کا دن ہے منحصر
وعدہ دید چاہیئے زحمت انتظار کیا

وحشت بقید چاک گریباں رہا نہیں ! دیوانہ تھا جو معتقد اہل ہوش تھا

کیا جانیئے کہ حشر ہو گیا صبح حشر کا
بیدار تیرے دیکھنے والے ہوئے تو ہیں

طولِ رودادِ غم معاذ اللہ ؎ عمر گذری ہے مختصر کرتے

فانی کی غم افشانی کی وجہ سے عام طور پر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وہ صرف رُلا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کے کلام کا بغور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ دامن پر گل کاری بھی کر سکتا ہے۔ وہ حزن وافسردگی ہی کے تخلیقی فلسفہ میں ید طولیٰ نہیں رکھتا بلکہ اس کے کلام میں تغزل کی چاشنی، پرکاری، نکتہ دری، کیف و سرمستی، رنگینی ومعاملہ بندی کے بھی اعلیٰ نمونے ملتے ہیں افسوس ہے کہ فانی کے بہت سے پڑھنے والوں نے ان اشعار کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ ان میں وہ حسن، تاثیر اور شعریت پورے طور پر موجود ہے جو فانی کے نزدیک شاعری کا سب سے بڑا معیار تھا[1]

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا ؎ بات پہنچی تری جوانی تک

خفا نہ ہو تو یہ پوچھوں کہ تیری جان سے دور
جو تیرے ہجر میں جیتا ہے مر بھی سکتا ہے

فرصتِ یک نظر کے بعد، حوصلۂ دعائے وصل
کیوں دلِ قدرناشناس اب یہ مجال ہوگئی

ہم کہاں اور نگاہِ شوق کہاں ؎ وہ بھی تیری نگاہ ہوتی ہے

---

[1] سب رس حیدرآباد۔ ریڈیو نمبر

دیکھئے یہ جنازہ بردوش شاعر اس لے میں بھی گا سکتا ہے۔

تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول اٹھے
وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے

ہر آن فتنہ ہے، ہر فتنہ اک قیامت ہے
ترا شباب ہوا، دورِ آسماں نہ ہوا

حیرت ہوتی ہے کہ یہ حسرتی موت، حسن کا ایسا ادا شناس، اور اس درجہ شیوا زبان و کافر بیان بھی ہو سکتا ہے۔

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا
مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا
اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا

چشمِ ساقی کی وہ مخمور نگاہی تو یہ
آنکھ پڑتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

دے ترا حسنِ تغافل جسے جو چاہے فریب
ورنہ تو اور جفاؤں پہ پشیماں ہونا

تجھے خبر ہے ترے تیرِ بے پناہ کی قسم
بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا

طبعِ نازک پہ بار اک اک حرف
حالِ دل، حرفِ داستاں انجام

کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں
کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی

یہ نور آگیں اشعار بھی فانی ہی کے ہیں، جس کو "سوزخواں" اور "مرگ پرست" کہا گیا ہے۔

اک برق سرِ طور ہے لہرائی ہوئی سی
دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

محضر ہے یہی قتلِ شہیدانِ وفا کا
جلاد کی چتون ہے جو شرمائی ہوئی سی

درپیش ہے پھر مسئلہ طاقتِ دیدار
پھر کچھ نگہِ شوق ہے گھبرائی ہوئی سی

جس دل پہ کی نظر وہی پہلو میں پھر نہ تھا
شوخی تو دیکھئے نگہِ انتخاب کی

تمہارے عشق کا اللہ رے فیض ؛ جگر میں دھوم ہے دردِ جگر کی

نہ بن پڑا کوئی عذرِ جفا کسی سے تو ہائے
ادا وہ یاد ہے گھبرا کے روٹھ جانے کی

زباں کٹتی ہے ذکرِ آشیاں پر ؛ تمنا تھی بہت کچھ آشیاں کی

حسنِ بیتاب خود نمائی تھا ؛ دل ہمیں روبرو کئے ہی بنی
چاک دامن کے مشغلے کے لئے ؛ چاک دامن رفو کئے ہی بنی
کھو گئے ہم کچھ اس طرح فانی ؛ کہ انھیں جستجو کئے ہی بنی

مانا حجابِ دید، مری بے خودی ہوئی
تم درجہ بے خودی نہیں یہ ایک ہی ہوئی
کیجئے دعا کہ اُف تو کرے درد مندِ عشق
اوّل تو دل کی چوٹ پھر اتنی دکھی ہوئی
یا رب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں
آواز آ رہی ہے یہ کب کی سُنی ہوئی

ان اشعار کی نازک خیالی سہل ممتنع کے درجہ پر پہنچ گئی ہے:-

ترک تدبیر کو بھی دیکھ لیا — یہ بھی تدبیر کارگر نہ ہوئی
اللہ اللہ یہ حسنِ پرسشِ حال — کہ مرے حال پر نظر نہ ہوئی
آج تسکینِ دردِ دلِ فانی — وہ بھی چارہ کئے مگر نہ ہوئی
کچھ نظر کہہ گئی، زبان نہ کھلی — بات ان سے ہوئی مگر نہ ہوئی
حشر کا دن بھی ڈھل گیا فانی — دل کی روداد مختصر نہ ہوئی

یا کہتے تھے کچھ کہتے جب اس نے کہا کہیئے
تو چُپ ہیں کہ کیا کہیئے کھلتی ہے زباں کوئی

ضبط کا حوصلہ نکل جاتا — کچھ ستم اور بھی کئے ہوتے

مشتاق خبر دار رہیں دل سے جگر سے
ملتی ہے زمانہ کی نظر ان کی نظر سے

من جائیں اگر تم ہمیں جھوٹوں بھی منا لو
وعدے سے تسلّی سے، دلاسے سے، قسم سے

اس غزل کا ہر شعر انتخاب ہے اور اس کے بیشتر اشعار رنج سے زیادہ مسرت کی کیفیت پیدا کرتے ہیں:-

قطرۂ دریائے آشنائی ہے ؛ کیا تری شانِ کبریائی ہے

تری مرضی جو دیکھ پائی ہے ؛ خلش دردکی بن آئی ہے

وہم کو بھی ترا نشاں نہ ملا ؛ نارسائی سی نارسائی ہے

کون دل ہے جو درد مند نہیں ؛ کیا ترے درد کی خدائی ہے

جلوۂ یار کا بھکاری ہوں ؛ شش جہت کاسۂ گدائی ہے

موت آتی ہے تم نہ آؤ گے ؛ تم نہ آئے تو موت آئی ہے

بچھ گئے راہِ یار میں کانٹے ؛ کس کو عذرِ برہنہ پائی ہے

ترکِ امید بس کی بات نہیں ؛ ورنہ امید کب بر آئی ہے

مژدۂ جنتِ وصال ہے موت ؛ زندگی محشرِ جدائی ہے

آرزو پھر ہے درپئے تدبیر ؛ سعئ ناکام کی دہائی ہے

موت ہی ساتھ دے تو دے فانیؔ ؛ عمر کو عذرِ بے وفائی ہے

اس غزل میں کیسی موسیقیت اور خوش آہنگی ہے اور اس خاموشی میں کتنی گویائی پوشیدہ ہے

آٹھ پہر کی یہ بے چینی، یہ بیتابی کیا کہیئے
حد سے گذری دل کی خرابی دل کی خرابی کیا کہیئے

تم کیا جانو کیا شے ہے طوفان سرشکِ خونیں کا
تم نے چھلکتے ہی نہیں دیکھی دل کی گلابی کیا کہیئے

ہائے وہ پہلی نظروں میں ہر موج کا ساحل بن جانا
بحرِ بے پایانِ محبت کی پایابی کیا کہیے

اگلے برس کے پھولوں کا کیا حشر انہیں معلوم نہیں
کلیوں کا یہ طرزِ تبسم یہ شادابی کیا کہیے

کتنے فتنے جمع کیے ہیں ان کی ایک جوانی نے
چال قیامت، کافر نظریں، آنکھ شرابی کیا کہیے

خاکِ وطن ہی راس نہ آئی غربت تو پھر غربت ہے
فانی اپنی خانہ بدوشی خانہ خرابی کیا کہیے

"خالص شاعری" (Pure poetry) میں ابداعِ سخن اور ندرتِ بیان کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ ان اشعار سے ہوگا:-

کاش میری زبان سے سنتے : اب جو سنتے ہو بے زبانی سے
خضر کو بھی ہے دور کی نسبت : چشم بد دور اس جوانی سے
کچھ خبر بھی ہے پوچھنے والے : زندگی روٹھتی ہے فانی سے
فانی اب ان کی یاد پہ کیا کیجیے نثار : مدت ہوئی وداعِ دل و جاں کیے ہوئے

اب انھیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے
چشم بد دور دلہن بن کے شباب آتا ہے

دل کھوئے ہوئے برسوں گذر رہے ہیں مگر اب بھی
آنسو نکل آتے ہیں جب دل نظر آتا ہے

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے
تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

فانی کے کلام میں فکر و جذبہ اور حسن و ادراک کا خوشنما امتزاج ہے۔ اس نے میر و غالب کی خصوصیات کو اپنے یہاں سمو لیا ہے فانی نے اس جہان معنی کے تیار کرنے میں مومن و غالب کی سی ترکیبوں سے بھی مدد لی ہے۔ مثلاً آرزوئے مشق رفو، شعلۂ آرمیدہ، عیش غم انجام، شکایت گاہ بے اثر، آرزوئے صبر شکن، غم کدۂ اعتبار، حرف داستان انجام اعتماد نوازش، حیات مرگ نواز۔ زبان اور بیان کی لطافت اور متانت نے ان کے کلام کا اثر بڑھا دیا ہے۔

فانی کے کلام میں طرفگیٔ مضامین اور تنوع خیالات زیادہ نہیں ہے اس نے اپنی دنیا غم سے بنائی ہے۔ لیکن اس کا غم قطرۂ وسعت طلب ہے جس سے کیفیات و جذبات کے طوفان برپا ہو سکتے ہیں۔ اس کی درد آشنائی اہم ہے اور بہت اہم لیکن اس کی رنگینی اور مسرت زائی بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ یہ نوحہ و نغمہ کی کیفیات بلیک ([illegible]) کی طرح اس کی اپنی ہیں۔ "وہ وہی دیکھتا ہے جو وہ دیکھتا ہے اور وہ وہی محسوس کرتا ہے جو وہ کرتا ہے"۔ یہ صداقت اور خلوص شاعری کی دنیا میں ایسی نعمت اور سعادت ہے جو نادر ہی سے حاصل نہیں ہوتی۔ فانی خالص شاعری کا علم بردار ہے۔ اس کے کلام میں تغزل شعر کی آمیزش

نہیں ہے ۔ اسی وجہ سے بعض وقت زرِ خالص کی طرح ان اشعار
کے آبگینوں کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ پھر بھی اس کا یہ
کمال کیا کم ہے کہ اس نے رضا کو تسلیم کی نظر سے دیکھا ہے
اور اس طرح بارِ حیات کو ہلکا کر دیا ہے ۔ اس نے تیرگیِ
شام کو نورِ سحر قرار دیا ہے ۔ اور اس طرح ہمیں ظلمت
کے برداشت کرنے کا اہل بنا دیا ہے ۔

فانی کی صوفیانہ شاعری

نشور واحدی

زندگی کے حقائق و معارف کو فانی نے جس وضعدار اور سوگوار انداز میں لکھا ہے وہ نہایت قابل قدر ہے۔ مگر اس نے اپنے اشعار میں جس قسم کی مجلسی اور رمزیاتی زبان استعمال کی ہے وہ صرف لکھنوی تغزل اور آرٹ میں پائی جاتی ہے۔ اس کے بیان کے اجزا اور لسانی روایات پر جس قدر غور کیجئے اسی قدر اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ اس نے لکھنوی تغزل اور آرٹ کے صحیح اور کھرے استعمال سے نہ صرف "الیات" کو عمدہ اور بجا طور پر ادا کیا بلکہ قدیم روایتی "لکھنویت" کو فرضی داستانِ الم سے نکال کر حقیقی "یاسیات" سے روشناس کر دیا لکھنوی تغزل کا مزاج فلسفۂ حیات و ممات اور مسائل تصوف کے لئے موافق نہیں۔ اس کے لئے فانی کے کمال کا ممنون ہونا پڑے گا کہ اس نے کاغذی پھولوں میں پائدار رنگ و بو کی تخلیق کی اور "عرفانیات" کی محفل کو معرفت کے گلدستوں سے سجایا۔

لکھنوی آرٹ سے استفادہ لکھنو اسکول اپنے الفاظ و محاورات، لب و لہجے کے لحاظ سے ایک مخصوص "لسانی ماحول" رکھتا ہے جس کی فضا میں گل و بلبل، قفس و آشیاں بجلی اور صیاد، دم نزع، رگِ جاں، ہچکی، میت، جنازہ، تربت،

شمع مزار، غم و ماتم، نوحہ و بکا، ذبح و خنجر، لاش، قاتل، بسمل، ظلم و ستم، دامن اور دھجیاں وغیرہ کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ فانی نے ان لفظوں اور آوازوں کو غم کے ساز میں بند کر کے حسرت و یاس کے دلدوز نغمے نکالے۔ یہی الفاظ جن کو مراثی و ماتم نے اپنا اشک خونیں پلا پلا کر پالا تھا۔ اس کے فلسفۂ غم کی تعمیر و تخلیق کے لئے خاکِ نمناک بن گئے جو ناگارا مسالہ سب تیار ملا۔ فانی کو صرف ایک ہوشیار معمار کی طرح اینٹیں رکھنی تھیں۔ بات کی بات میں "یاسیات" کا ایک عالیشان مقبرہ تیار ہو گیا۔ جو تاج محل کے روضہ کی طرح صناعی کا بہترین نمونہ اور حسین آرزوؤں کا بے نظیر مدفن ہے۔

نزع اور لہو کے دل گداز مضامین سے سہارا لیکر بہتوں نے شعر کہے ہیں مگر فانی سے سنئے:

مری اک عمر فانی نزع کے عالم میں گذری

محبت نے مری اک رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں

لاش اور ماتم سے محشر سکوت پیدا کرنا اسی کا کام ہے:

برپا تھا دل کی لاش پہ اک محشر سکوت

تیرے شہید ناز کا ماتم خموش تھا

نزع میں ہچکی کے یہ معنی ہیں:

تھم تھم کے آ رہی ہیں دم نزع ہچکیاں

رہ رہ کے ٹوٹتی ہیں امیدیں رکی ہی

قاتل و بسمل کی پارینہ داستان بھی بے نتیجہ نہیں ؎

رگ رگ میں اب اندازِ بسمل نظر آتا ہے
ہر سانس کے پردے میں قاتل نظر آتا ہے

فانی کی تربت کا بھی ایک سماں کس قدر عبرتناک ہے ؎

ذرہ ذرہ تربتِ فانی کا شیون جوش ہے
اس صفِ ماتم میں اک شمعِ لحد خاموش ہے

تعمیر نشیمن کی اہمیت کا اندازہ برق و صیاد کی آشیاں براندازی سے لگایا جا سکتا ہے ؎

کل تک یہی گلشن تھا صیاد بھی بجلی بھی
دنیا ہی بدل دی ہے تعمیر نشیمن نے

آپ نے دیکھا فانی غم و ماتم کے ان الفاظ سے کھیلتا نہیں بلکہ ان کے جاندار استعمال سے جہاں معنی کی ایک نئی توجیہہ اور نئی گہرائی پیش کرتا ہے۔ یہی نہیں وہ انھیں آوازوں نغموں اور باریک کر کے نغمات میں تبدیل کر دیتا ہے۔ قفس و آشیاں سے کعبۂ دل کی تعمیر کرتا ہے۔ بجلیوں سے نظامِ حیات میں روح بھرتا ہے۔ شمعِ مزار سے بے ثباتیٔ عالم کے مرقع تیار کرتا ہے۔ دمِ نزع کی ایک ہچکی میں حیات کی حقیقت کہہ دیتا ہے۔ رگِ جاں، بجلی، محشر کی ترکیب سے انسان کا خمیر تیار کرتا ہے ؎

برق دم لینے کو ٹھہرے تو رگِ جاں ہو جائے
فتنۂ حشر تھم ہو تو انساں ہو جائے

گل و بلبل سے ثباتِ کائنات اور اضطرابِ حیات کے اسرار کھولتا ہے ؎

سکونِ خاطرِ بلبل ہے اضطرابِ بہار
نہ سوج بوئے گل اٹھتی نہ آشیاں ہوتا

جہاں جذبۂ تعمیرِ حیات ہے وہاں تخریبی طاقتیں بھی دنیا میں نمودار ہوتی رہتی ہیں۔ فانی نے بہت اچھے انداز میں اس نکتہ کو ظاہر کیا ہے مگر برقِ و آشیاں کا دامن نہیں چھوڑا ہے ؎

کل تک یہی گلشن تھا صیاد بھی بجلی بھی
دنیا ہی بدل دی ہے تعمیرِ نشیمن نے

حیاتِ مستعار کا یہ پھیلاؤ اور اہتمام اور پھر اس کا مختصر محل عبرت و بصیرت ہے دو تین ہچکیوں میں فانی اس کی شرح کر گیا ہے ؎

دو تین ہچکیوں میں دمِ نزع کہہ گیا
شرحِ دراز زندگیٔ مختصر کو میں

لکھنؤ اسکول کے طرزِ ادا میں صنائع بدائع کو خاص دخل ہے ان کے یہاں رعایتِ لفظی کو اظہارِ خیال میں "رمزیت" کا درجہ حاصل ہے "تضاد" پر لکھنوی آرٹ سر دھنتا ہے۔ فانی نے ان تمام طلسمات سے ادائے معانی کا کام لیا ہے۔ عزیز لکھنوی اور فانی دونوں تخیلی لحاظ سے غالب کی پیروی کو پسند کرتے تھے۔ مگر بولی اپنی بولنا

چاہتے تھے۔ لکھنؤ کی نازک اور چڑا ؤ زبان فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات کی شکست و ریخت کو کہاں برداشت کر سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عزیز کی بلند پروازیاں قفس میں زحمت پرواز ہو کر رہ گئیں۔ انگڑائی کے متعلق عزیز کا ایک شعر ہے جس پر لکھنؤ کو فخر ہے ؎

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن

بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

پہلے مصرعہ میں شاعر غالب کے فلک تخیل کو چھو رہا ہے مگر دوسرے مصرعہ میں لکھنؤ کی کسی پرانی گلی کی خاک اڑا رہا ہے۔ مصرعہ اول کی پرواز مصرعہ ثانی سے سنبھل نہ سکی۔

اس طرز میں فانی عزیز سے زیادہ کامیاب رہا۔ بلکہ عزیز نے جس محل کی تعمیر کا خواب دیکھا تھا فانی نے اس کی کچھ تعبیر دنیائے ادب میں پیش کی۔

فانی ایک زبردست صناع بے مثل کاریگر ہے۔ وہ فلسفہ اور تصوف کی بلوریں سلوں کو سو ٹکڑے کر کے ایسے نگین تیار کرتا ہے جو آسانی سے جڑاؤ انگوٹھی میں جڑے جا سکیں۔ اس نے تصوف کے ان مسائل کو جن کی تشریح بے لطف یا بے نتیجہ تھی الفاظ کے الٹ پھیر سے سمجھا دیا ہے ؎

نشانِ مہر ہے ہر ذرہ ظرف مہر نہیں

خدا کہاں نہ ملا اور کہیں خدا نہ ملا

حقیقت حیات کے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے دوسرے شعراء نے کیا کیا طریقے اور اسلوب اختیار کئے ہیں۔ اقبال نے "سرآدم ہے ضمیرِ کُن فکاں ہے زندگی" کہہ کر حیات کو نگاہِ عام سے اوجھل کر دیا ہے۔ فانی "موت اور زندگی" کے "تضاد" سے اسرار حیات کی تمام گتھیاں سلجھا دیتا ہے ؎

مژدۂ جنت وصال ہے موت ؛ زندگی محشر جدائی ہے

زندگی کا عرفان اس سے زیادہ صحیح اور بیان اس سے زیادہ جامع اور کیا ہو سکتا ہے۔ "مرنے اور جینے" کے دو لفظوں میں زندگی کی حقیقت حال کہہ دی ہے ؎

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میّت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

ایسے مسائل جو متضاد پہلو رکھتے ہیں جنہیں کم از کم دو شعروں میں جدا جدا بیان کیا جا سکتا ہے۔ انہیں "تضاد" کی مدد سے صرف ایک شعر یا ایک مصرعہ میں رکھ دیا ہے ؎

غم و راحت جسے قسمت کے دھنی پاتے ہیں
دم وہ مشکل ہے کہ موت آئے تو آساں ہو جائے

کفر و ایماں کے تقابل میں اپنے دقیق امتیازات کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا ہے ؎

عشق وہ کفر جو ایماں ہے دل والوں کا
عقل مجبور وہ کافر جو مسلماں ہو جائے

اس کے یہاں متضاد الفاظ کے استعمال کا جذبہ عشق کی حد تک پہنچا ہوا ہے صرف ایک ہی غزل کے چند شعروں کی تشریح و تمثیل کے لئے کافی ہیں، مگر اس کا یہ جنون مصلحت آمیز بلکہ معرفت خیز معلوم ہوتا ہے۔

کیوں نہ نیرنگ جنوں پہ کوئی قرباں ہو جائے
گھر وہ صحرا کہ بہار آئے تو زنداں ہو جائے

ذرہ وہ راز بیاباں ہے جو افشا نہ ہوا
دشت وحشت ہے وہ ذرہ جو بیاباں ہو جائے

غم محسوس وہ باطل جسے کہتے ہیں مجاز
دل کی ہستی وہ حقیقت ہے جو عریاں ہو جائے

خلد میخانہ کو کہتے ہیں بقول واعظ
کعبہ بت خانے کو کہتے ہیں جو عریاں ہو جائے

فانی کی یہ شعر گوئی جس میں "خالص شاعری" کے چٹخارے اور متصوفانہ اشارے ہیں تضاد اور رعایت لفظی کے اس رنگ میں آتش کے مرقع تصوف کی یاد تازہ کرتی ہے۔ آتش کی غزل ع

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا

اور فانی کی مندرجہ بالا غزل کا مقابلہ کیجئے تو ایک ہی صنعت گاہ کے دو کاریگر معلوم ہوتے ہیں۔ ایک کا کام ذرا موٹا اور دوسرے کا باریک ـــــ فانی کے یہاں غالب کی طرح "گنجینۂ معنی کے

طلسم بھی ہیں۔ ان طلسمات کی تہہ میں حقائق و معارف کے چھوٹے چھوٹے دفینے اور ننھے ننھے گنجینے ہیں۔ جن تک پہنچنے کے لئے کاوش ذہنی کی زحمت درکار ہے۔ لیکن فانی نے حسرت کی طرح لکھنوی اور دہلوی رنگ کی آمیزش کا دعویٰ نہیں کیا۔ اگرچہ بحیثیت فن کار وہ لکھنوی آرٹ اور دہلوی خلیت کی ترکیب و تعمیر میں تمام اردو شاعروں میں ممتاز ہے۔

دہلوی رنگ اور میر، غالب کا تتبع جہاں وہ الفاظ کی اس صنعت گری سے آزاد ہو کر خالص دہلوی رنگ میں کہتا ہے وہاں اس کا کلام زیادہ دیرپا گہرا اور موثر ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچکر فانی نے دنیائے تغزل کو نشاط ثانیہ کے نئے پیغامات بھیجے، معرفت کے دھیمے راگ الاپے اور یابست کے سانچے تیار کیئے ہے

منزل عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

اکثر نقادوں نے فانی کو غالب کا پیرو بتایا ہے۔ حالانکہ جہاں تک غالب کی پیروی کا تعلق ہے کیا طرز ادا اور کیا ایجاد معانی بہر صورت وہ ناکامیاب رہا۔ شاعری صرف بات میں بات پیدا کرنے اور بال کی کھال نکالنے کا نام نہیں۔ شاعری یہ بھی ہے کہ کوئی بات کہی جائے اور حسن کے ساتھ ـــ فانی کوئی حکیمانہ بات

نہیں کہتا۔ وہ "شعور جزوی" کا شاعر ہے۔ بات میں بات پیدا کرنا اس کا کمال ہے اور ثانوی نکتہ سنجی اس کا ذہنی شعار۔ علاوہ بریں اس کے اسلوب بیان کی محدودیت، فکر کی یکسانی، غالب کی سی حکیمانہ اور فلسفیانہ شاعری کے لئے ناکافی ہے یہ ضرور ہے کہ اس نے غالب سے استفادہ کی ذہین کوشش کی، الفاظ اور ترکیبیں اس سے عاریتاً مانگیں، مضمون اس سے لئے اور ایک نئی توجیہہ کے ساتھ اپنے رنگ میں پیش کر دیا لیکن اس عاریت خواہی اور "جزوی مضمون بندی" کو غالب کے "طرزِ ادا" کا درجہ نہیں دیا جا سکتا اور نہ اس کو غالب کی کامیاب پیروی کہہ سکتے ہیں۔

اگر "آس اور یاس" کا حجاب اٹھا دیا جائے تو فانی "فریلی خیال آفرینی" دقت پسندی اور اختصار میں مومن سے اور صنعتگری میں آتش سے قریب تر نظر آئے گا۔ پھر بھی اسے غالب، مومن اور آتش کے خانوں میں بانٹ کر تمام نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اس اسلوبی تقسیم کے بعد بھی بہت کچھ رہ جاتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے بھی کلام فانی کے دیباچہ میں اس کے فلسفیانہ رنگ کو غالب سے بہتر اور برتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ دیباچہ زیادہ ہے اور تبصرہ کم، فنی نقطہ نگاہ سے فلسفیانہ شعروں میں اسلوب بیان کی اہمیت نفس مضمون سے زیادہ ہونی چاہیئے۔ برخلاف اس کے عاشقانہ نغموں میں

مضامین تخیل اور واقعات کی رنگینی، دلکشی اور سچائی کافی ہے طرز ادا
کی کمی زیادہ محسوس نہیں کی جاتی چنانچہ اردو میں حسرت کی عاشقانہ
شاعری اس کی عمدہ مثال ہے، مگر جن شعرا نے فلسفہ اور تصوف
جیسے ٹھوس اور ٹھس مضامین کو اپنا تخیلی سرمایہ بنایا ہے۔ ان کے
نئے اسالیب بیان کی ایجاد و اختراع تعین و تلوین نہایت اہم ہے
رشید احمد صدیقی نے فانی اور غالب کے موازنے میں غالب کے
طرز و اسلوب کی نادرہ کاری کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہمارے ایک
نئے نقاد کلیم الدین صاحب بھی استوے اسلوب و معانی کی غلط
فہمی میں مستقل طور پر غلطاں و پیچاں ہیں۔ فانی کے متعلق ان کی رائے
دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

"فانی نے اپنے اشعار میں طرز غالب کی کامیاب پیروی کی
ہے۔ لیکن ان میں ایک قسم کی ثقالت ہے۔ یہ ثقالت غالب کی لفظی
ثقالت نہیں، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فانی کے دماغ کی رفتار
آہستہ ہے۔ یہ اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے کامیابی کے ساتھ پہنچ
جاتا ہے۔ لیکن اس کی رفتار میں وہ تیزی وہ سبک رفتاری نہیں
جو اکثر غالب میں اپنا رنگ دکھلاتی ہے۔"

فانی کی آواز میں ایک قسم کی گلوگیری اور شعری مزاج میں
ایک نوع کی وابستگی ہے۔ ثقالت سے اس کو کوئی واسطہ نہیں۔
رہی "غالب کی کامیاب پیروی" اس کے متعلق خود کلیم الدین صاحب

رقم طراز ہیں" فانی کا دماغ یا تخیل غالب کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا"
ایک جگہ اور فانی کی بابت لکھتے ہیں۔

"ان کی آواز بلند آہنگ ہے نرم و شیریں نہیں، لیکن بلند آہنگی گراں نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ خوش آہنگ بھی ہے اس بلند خوش آہنگی کے ساتھ ایک زور بھی ہے' ایسا زور جو اپنی طاقت سے واقف ہے جسے اپنی کامیابی کا یقین اور اپنی قدر و قیمت کا احساس ہے ...... اس یقین کی وجہ سے ان کی شاعری میں رعب و دبدبہ کا اثر قارئین کے دل و دماغ پر ہوتا ہے۔"

فاضل نقاد جو کچھ کہنا چاہتے ہیں شاید اس کے لئے الفاظ مساعدت نہیں کرتے یہ اردو زبان کی کم مایگی یا تنقیدی ادب کی تنگ دامانی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فانی کی لے میں آہستہ خرامی اور گراں باری، اس کی نوا میں سردی و افسردگی اس کے آہنگ میں وقار اور طاقت ہے۔ جیسے کوئی گہرا برفانی سمندر آہستہ آہستہ بہہ رہا ہو۔ بڑی بڑی برف کی چٹانیں اس کی سطح پر لرزتی ہوئی تیر رہی ہوں اور کبھی کبھی ساحل سے ٹکرا جاتی ہیں —— اس کی شاعری میں "رعب و دبدبہ" کے کوئی معنی نہیں۔ سودا کے قصائد میں یا اقبال کے تیوروں میں کچھ سطوت کے انداز پائے جاتے ہیں مگر فانی کے یہاں اس قسم کی کوئی چیز نہیں، ہاں اس کے الفاظ میں سبکباری کی جگہ گراں باری اور وزن پایا جاتا ہے۔ اس کے دونوں

رنگ کی غزلوں میں سنجیدگی اور وقار، افسردگی اور یاس کے اجزاء موجود ہیں۔

مضمون سے زیادہ اس کا طرزِ ادا غمگین ہے۔ وہ غمگین بھی کم ہے اداس بہت ہے اس میں درد سے زیادہ ضبط، غم سے زیادہ ماتم، یاس سے زیادہ شکست کا احساس پایا جاتا ہے اس کا صحیح مقابلہ صرف میر سے ہو سکتا ہے۔ یاسیت، غم، ناکامی تصوف، تفکر، درد۔ تاثیر یہ وہ چیزیں ہیں جو دونوں میں مشترک ہیں۔ فانی کی بہترین شاعری وہی ہے جس میں میر تقی میر کی یاسیت کے ساتھ دورِ جدید کی مضمون آفرینی اور صناعی پائی جاتی ہے۔ یہی میر کے انداز کا نیا پہلو اور دہلوی رنگ کا بناؤ ہے۔ اس رنگ میں یاسیت کا نمونہ یہ ہے۔

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچہ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں، دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا
منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا
فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا
فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

ایک اور غزل اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی۔

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

فلسفیانہ بیان میں یہاں وہ صنعت گری باقی نہیں جس کا نمونہ پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔

پہلوئے زوال ہوں معنی کمال میں
میں ہوں جدا امتیاز جلوہ و جمال میں

آدمی میں کچھ نہیں آپ نے سمو دیا
عالم غبار کو عالم خیال میں

ابتدائے زندگی انتہائے زندگی
آپ کے خیال سے آپ کے خیال میں

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

فریب امن میں کچھ مصلحت تو ہے ورنہ
سکون کشتی و توفیق ناخدا معلوم

یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانیؔ
وجود دردِ مسلّم علاج نا معلوم

اس رنگ کی غزلوں میں صوفیانہ خیالات نہایت بلیغ اور غیر جذباتی انداز میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

میں ہوں اک مرکزِ ہنگامۂ ہوش ذرم ہوش
دل اگر عالم مستی ہے تو سر عالم ہوش

بیخودی مایۂ عرفان خودی ہے یعنی
محرمِ جلوۂ اسرار ہے نا محرم ہوش

کچھ نہ وحدت ہے نہ کثرت نہ حقیقت نہ مجاز
یہ ترا عالم مستی وہ ترا عالم ہوش

جینے کی ہے امید نہ مرنے کا یقیں ہے
اب دل کا یہ عالم ہے نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

گم ہیں رہِ تسلیم میں طالب بھی طلب بھی
سجدہ ہی در یار ہے سجدہ ہی جبیں ہے

کچھ مظہر باطن ہوں تو کچھ محرم ظاہر
میری ہی وہ ہستی ہے کہ ہے اور نہیں ہے

کلام کی فضامیں صوفیت سنجیدہ بیان، یاس انگیز لہجہ، حیات کی گہرائی، انجام ہستی کی جھلکیاں جا بجا خود ایسی چیزیں ہیں جن کی ترکیب و امتزاج سے عالم شعر میں ایک

صوفیانہ فضا پیدا ہو جاتی ہے اور بے ثباتی عالم کے مرقعے نگاہوں میں پھرنے لگتے ہیں۔ اس عالم میں یہ ضروری نہیں کہ شاعر بالقصد کوئی تصوف کا نکتہ ادا کرے۔ کوئی بھی شاعرانہ خیال یا پہلوئے جمال ہو اس "غم عیسیٰ" میں ڈوب کر خرقۂ فقر کے گیروے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ مطالعہ کرنے والوں کا ذہن معانی و مطالب سے زیادہ کلام کی سنجیدہ فضا سے متاثر ہوتا ہے۔ جس طرح ایک سنسان گورستان سے گذرنے والا کوئی حساس آدمی خود رو سبزوں اور پھولوں کی رعنائی اور زیبائی سے زیادہ وہاں کی عبرت انگیز اور وحشتناک دائمی خاموشی سے متاثر ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ کسی حسین نباتی منظر کے تحرک اور تجلّی سے یہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ "سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں"۔ یہی صورت مجموعی حیثیت سے فانی کے کلام کی ہے۔

ایک جگہ وہ باغ و بہار کے جلوؤں میں کلیوں کو تبسم ریز دیکھتا ہے۔ مگر ان کی مسکراہٹ میں گریہ سامانی کے سوا اسے کچھ نظر نہیں آتا ؎

ہر تبسم کو چمن میں گریہ ساماں دیکھ کر
جی لرز جاتا ہے ان غنچوں کو خنداں دیکھ کر

قفس میں موسم گل کا تصور اس کے یہاں کس قدر نیرنگ و حسرت انجام ہے ؎

جب قفس میں موسم گل کا تصور بندھ گیا
ہر طرف ایک اُجڑا ہوا آشیاں دکھا گئے

گلستانِ جہاں اس کے نزدیک عیش و عشرت کا اک دامِ رنگیں ہے جس میں اسیر ہو کر انسان مبتلائے غم و آلام ہو جاتا ہے ؎

گلشن صلائے عامِ اسیری ہے سر بسر
پھیلا دیا بہار نے پھولوں پہ دامِ عیش

امید کی دلنوازیاں بھی اُسکے یہاں "اضمحلالِ رنگیں" کی شکل اختیار کر لیتی ہیں ؎

غمِ امید کے صدقے وہ اضمحلالِ رنگیں ہوں
بہار آنے سے پہلے جو چھا جائے گلستاں پر

دلِ آگاہ کا فیضان یہ ہے کہ وہ حجاباتِ غفلت اٹھا کر جلوہ گاہِ حیات تک پہنچا دے مگر اس کے تجربے میں وہ متاعِ ہستی کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتا ہے ؎

دلِ آگاہ سے کیا کیا ہیں امیدیں تھیں
وہ بھی قسمت سے چراغِ تہہ داماں نکلا

جس فضا میں وہ سانس لیتا ہے وہاں حیات و کائنات کی جاذبِ نگاہ تجلیاں مہمل اور بے معنی ہیں نظامِ قدرت کی تشکیل جمالی پہ نگاہوں کا اعتماد احساس کی خود فریبی ہے ؎

ہر شر دہ نگاہ غلط جلوہ خود فریب
عالم دلیل گمرہی چشم و گوش تھا

اس کے عشق کی رگوں میں گرم لہو کے بجائے یاس و حرماں کا برفاب

گردش کرتا ہے۔ محبت افسردہ، آہیں ٹھنڈی۔ عشق کا اثبات بھی اس کے یہاں وجود کی نفی سے شروع ہوتا ہے ؎

عشق عشق ہو شاید حسن میں فنا ہو کر
انتہا ہوئی غم کی دل کی ابتلا ہو کر

یہ فانی کے طرزِ احساس کے کرشمے اور اندازہ نگاہ کی کارفرمائیاں ہیں۔ شاعر کا طرزِ احساس کافی حد تک شعری نتائج کے استنباط میں دخیل ہوتا ہے۔ استدلال کا رخ بدل دیتا ہے اور شعور کو متغیر کر دیتا ہے۔ جس طرح مختلف فلسفی ایک واقعہ سے مختلف قسم کے نتائج نکال سکتے ہیں اسی طرح مختلف شاعر ایک حقیقت سے مختلف طرح کے "شعوری پہلو" پیدا کر لیتے ہیں۔

فانی کا طرزِ احساس انجام پرست واقع ہوا ہے وہ زندگی کے ہر پہلو کو انجام بین آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اس کی "شعری عقلیت" محسوسات کی رنگا رنگ سطح سے اخذ و استدلال نہیں کرتی بلکہ ذرا گہرائی میں جا کر معقولات اور تغیرِ حالات سے شکست و زوال کے المناک نظریئے مرتب کرتی ہے وہ زندگی کی تخریب نہیں کرتا لیکن تعمیر کو ایک سعیِ لاحاصل قرار دیکر اس سے لذت اندوز ہوتا ہے اس کی انجام پسندی میں آغاز کا جزو شامل نہیں۔ اگرچہ یہی آغاز حرکت و عمل کے عناصر کی رقص گاہ ہے اس کے یہاں انجام ہی انجام ہے اس انجام پرستی کا عبرتناک ماحول صوفیانہ معتقدات کے اظہار

کے لئے بہت معین ثابت ہوا اگرچہ اس کا تصوف زیادہ تر ذاتی ہے نہ کہ کائناتی۔

غم و ناکامی اور متصوفانہ خیالات

فانی ایک زندہ جنازہ ہے جس کو یاس والم اپنے ماتمی کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ مگر اس کے دل کی لرزش انفاس کی آمد و رفت اس کے زندۂ جاوید شعروں میں صاف محسوس کی جا سکتی ہے ؎

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

وہ مرنے سے زیادہ جیے جانے کا قایل ہے۔ موت اس کا "قال" اور "حیات" اس کا "حال" ہے۔ غم کی شوری اس کے یہاں ضرور ہے لیکن انسان کو روحانی غذا بھی درکار ہے اور اس غذائے روحانی میں "غم" نمک کا درجہ رکھتا ہے جس کے بغیر زندگی یا آرٹ بالکل پھیکا اور بے مزہ ہے وہ شاعری جس میں غم کی چاشنی بالکل نہ ہو طبیعت کو بہت جلد سیر کر دیتی ہے۔ فانی کا غم بہت حسین اور دیرپا ہے۔ احساس الم نے اس کی آرزوں میں استحکام اور عمق پیدا کر دیا ہے۔ لیکن اس کے کلام کا کچھ حصہ ایسا بھی ہے جس میں غم ہے مگر یاس نہیں۔ آرزوئیں ہیں مگر شکست نہیں، بلفظ دیگر اس کی شاعری کا ایک دور وہ بھی گزرا ہے جس کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ

کہا جاسکتا ہے کہ فانی کبھی زندہ تھا۔ آرزومند تھا۔ اس کے احساسات میں یہ تلخیاں اور تبدیلیاں افکار و تجربات کی باز شناخت اور بازگداخت سے پیدا ہوگئیں یہاں تک کہ اس کا ذوقی اور طبعی میلان اس کی "شعری عقلیت" پر غالب آگیا۔

جب وہ زندہ تھا اور آرزومند اس وقت آرزو برائے آرزو کے لئے بھی تیار تھا ؎

تم سے ملنے کی آرزو ہی سہی
تم سے ملنے کی آرزو تو کریں

تمنائے صحرانوردی اور جہاں گردی کا یہ عالم تھا ؎

بزم الست، دار فنا، جلوہ گاہ حشر
پہنچا ہے لے کے ان کی تمنا کہاں کہاں

حجاب در حجاب حسن آنکی فطرت کو ناکام نہیں بنا سکا ؎

چہرے پہ بڑھا لیجئے اتنے ہی نقاب اور
ناکام تماشا بھی ناکام نہیں ہے

کبھی وہ ایک یاد رنگیں سے حیات کی رگوں میں تازہ لہو بھر لیتا ہے ؎

حاصل بے خبری لازمۂ ہوش ہوئی
یاد تیری کسی عنواں نہ فراموش ہوئی

ابتدائے عشق کی بھولی باتیں بھی سن لیجئے ؎

ابتدائے عشق ہے لطف شباب آنے کو ہے
صبر رخصت ہو رہا ہے اضطراب آنے کو ہے

نگاہِ شوق کو بے باکی اور خود سپاری کے لئے برانگیختہ کرتا ہے ؎

اُٹھ نگاہِ شوق اُٹھ متاعِ جاں لئے ہوئے
وہ دامنِ نگاہ میں ہیں بجلیاں لئے ہوئے

گنہگاری اور سیہ کاری میں امید کی تجلیاں دیکھتا تھا ؎

ترے کرم سے کیا سماں ہے عالمِ گناہ کا
سیاہیاں امید کی بجلیاں لئے ہوئے

اس کے بعد وہ نا امید ہونے لگتا ہے اور سوچتا ہے کہ زندگی کا انجام شاید موت کے سوا کچھ نہیں ؎

وعدۂ معلوم کا فانیؔ کہاں تک انتظار
زندگی کا موت سے پہلے بھی کچھ انجام ہے

وہ اپنی تدبیر کے تار و پود بکھرتے اور شیرازۂ آرزو کو منتشر ہوتے دیکھ کر کہتا ہے ؎

دیکھ فانیؔ وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو
اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

مگر ایک بار پھر سنبھالا لیتا ہے اور اپنی تمناؤں کی گرتی ہوئی محرابوں کو تھوڑی تھمنے کے بل پر قائم رکھنے کی ناکام کوشش کرتا ہے اور اپنی اس سادگی اور خود فریبی کا احساس بھی رکھتا ہے ؎

پھر فریبِ سادگی ہے رہنمائے کوئے دوست
مٹنے والی آرزوئیں لے چلیں پھر سوئے دوست

پھر ایک اضطراب کا عالم ہے اور امید کی سلسلہ جنبانی ؎

اللہ بچائے نظر یاس سے دل کو
امید ہے پھر سلسلہ جنبانِ تمنا

پھر دل بیتاب ہے آرام جانِ اضطراب
پھر تمنا ہے کسی کی میہمانِ اضطراب

امید کا دامن بہت مضبوطی سے تھامتا ہے ؎

ہاں اے یقین وعدہ دامن ترا نہ چھوٹے
یہ آسرا نہ ٹوٹے وہ آئیں یا نہ آئیں

چراغ مزار کی بے رونقی اور مردہ دلی پر اظہار تعجب کرتا ہے ؎

نہ دن کو چپ ہیں نہ راتوں کو تری طرح اداس
جلے ہوئے تو چراغ مزار ہم بھی ہیں

امید کی قدر و قیمت اور اس کی حیات بخشی کے متعلق یہ جذبہ تھا ؎

امید بھی کیا شے ہے کہ ہر سانس میں فانی
کچھ زندگی خضر سے پاتا ہوں قرینے

مگر امیدوں کے چراغ پھر جھلملانے لگے اور مایوسی کی اندھیری نے آخر در دلِ پر دستک دی ؎

پھر یاس نے رکھا ہے قدم خانۂ دل میں ؛ یعنی ہے اب اللہ نگہبانِ تمنا

مرگِ آرزو قریب سے قریب تر آگئی ؎
دشنۂ غم کو مبارک نذرِ خونِ آرزو
زیست کو مژدہ کہ مرجانے کا ساماں ہوگیا

آخر بیمارِ غم مرجاتا ہے ؎
وہ جی گیا جو عشق میں حد سے گذر گیا
عیسےٰ کو ہو نوید کہ بیمار مرگیا

مرگِ آرزو اور ناکامی زیست کی یہ المناک منزل، زندگی کا موڑ اور حیات کا دوراہہ ہے یہاں پہنچکر زندگیاں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ روحیں حسب استعداد عروج و زوال نقص وکمال کے مراتب طے کرتی ہیں۔ یہاں "اسباب مساعد" "عقل سلیم" یا "ساقی کی اک نگاہ صحیح رہنمائی کر سکتی ہے۔ وہ اشخاص جو طبعاً عیش پسند سست کردار ہیں۔ وہ اس دوراہے پر پہنچکر راہ فرار اختیار کرتے ہیں وہ افراد جن کی رگ و پے میں "فعالیت" ہے وہ اپنی عالی ہمتی کی وجہ سے پہلے سے بھی زیادہ ٹھوس، مستحکم اور وسیع مقاصد و اغراض کی پیروی کرتے ہیں مگر جس کی طبیعت میں لطافت اور شفافیت اور روح میں گہرائی اور پرواز ہوتی ہے وہ اس موڑ پر پہنچکر روحانیات اور ماورائیات کے ان دیکھے راستوں کی طرف مڑجاتا ہے کسی رہبر کے سہارے یا یکہ و تنہا اس صحرائے بے پایاں میں خاک چھانتا پھرتا ہے۔ کبھی بھول بھٹک کر وادیٔ خموں میں فنا کی نیند سوجاتا

ہے۔ اور کبھی علم و عرفاں کی بلند ترین چوٹیوں سے مادی دنیا کو پیغمبرانہ یا شاعرانہ لہجے میں پکارتا ہے اور اپنے اعجازِ سخن سے عشق و عقل دونوں کافروں کو مشرف بہ ایمان کر لیتا ہے ؂

عشق وہ کفر کہ ایمان ہے دل والوں کا
عقل مجبور وہ کافر جو مسلماں ہو جائے

فانی کی صوفیانہ شاعری اسی شکست و ناکامی کی ایک آواز ہے۔ گردش لیل و نہار نے اس کے لئے گنجینۂ معرفت کے دروازے کھول دیئے اور "آستان بصیرت" سے اس نے اتنا کچھ پایا کہ عبرت کی داستانیں اسی کی یادگار رہیں۔ بدایوں سے غم حیدر آباد سے غربت۔ دلی سے دل۔ لکھنؤ سے زبان اسی شاعر نے پائی۔

تصوف بحیثیت نظر و عمل مغربی تقلید کے طور پر اگر تصوف کا لفظ صرف مخالفت کے کانوں سے نہ سنا جائے تو اتنا مسلّم ہے کہ مذاہب کو رواداری، دولت کو دردِ دل، سلطنت کو صلح کل، دماغ کو بلندی، دل کو دھڑکن، نظر کو وسعت، اخلاق کو پاکیزگی اور پاکیزگی کو پائداری صرف تصوف نے عطا کی، آج کی دنیائے علم و دانش کی اقتصادی اور اخلاقی کمزوریوں نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ دنیا میں اخلاقیت، امن اور انصاف کا قیام عقل و حکمت، آئین و قوانین

سے ممکن نہیں۔ اور نہ مذہبی اور معاشرتی سہارے سے اس کا کوئی
امکان ہے۔ صرف اور صرف روحانیت کی بلندیاں ہی دنیا پر
عالمگر اخوت، بے پایاں محبت اور امن و عافیت کے پھول برسا سکتی
ہیں۔ کیا تعجب کہ عالم مادی کسی "آواز اندرون" کی خاموش گنگناہٹ
کے سہارے اس نظام "جاہ وحسد" سے چھٹکارا حاصل کرے۔ خود
انقلاب روس پکار رہا ہے کہ انسانی اختلاف "روٹی" سے ختم نہیں
ہوسکتا۔ اور نہ آدمی صرف "روٹی" سے زندہ رہ سکتا ہے۔

ہر سیاسی یا مذہبی تحریک اپنی تہہ میں کوئی فلسفہ رکھتی ہے خاص
مذہب جو ماورائی اخلاق کا مبلغ اور خدا کی خدائی کا مدعی ہے کیونکہ
اس قدر سطحی اور عقل و اسباب کی گہرائی سے خالی ہو سکتا ہے "خدا"
کا لفظ آتے ہی شکوک و شبہات، یقین و ایمان کے ہزاروں دفتر
کھل جاتے ہیں۔ جس کے نتیجہ کے طور پر فلسفہ و نظر کی عظیم الشان تعمیر
وجود میں آتی ہے۔ اصطلاح میں تصوّف، فلسفۂ مذاہب کا نام ہے
جس کی حدیں دنیا کے تمام گہرے فلسفوں سے قریب تر ہیں اہل تصوّف
کا طریقہ استدلال اور مناظرہ نہیں بلکہ یہ لوگ فکر و عمل مجاہدہ اور
مشاہدہ کو دعوت دیتے ہیں۔ تحریری صورت میں امثلہ اور تشبیہات
کی مدد سے نظام حیات و کائنات پر روشنی ڈالتے ہیں یہ تصوّف
کی نظری حیثیت ہوئی۔

منظّم سلسلہ بیعت، تبلیغ اور گروہ بندی کے لحاظ سے تصوّف

کی حیثیت ایک عوامی تحریک کی بھی ہے جو دولت اور مذہب کی سیاسی سازش اور ملاؤں اور عسکریت پسندوں کی خشک اور جابرانہ حکومت کے خلاف بغاوت کی صورت میں رونما ہوئی۔ اہل تصوف کے ساتھ وہی قید و بند، جلا وطنی، دار و رسن کا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ جو آج کل سیاسی رہنماؤں کے ساتھ جائز رکھا جاتا ہے۔ آج کل کا انقلابی اس زمانے کے صوفی سے بہت قریب ہے۔ اس لحاظ سے اگر اس عہد کے تصوف کو "روحانی اشتراکیت" کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ ہندوستان میں بھی آزادی و انقلاب کی سب سے پہلی آواز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ایک صوفی ہی نے بلند کی تھی غرب و عجم میں ہر نعرہ روشن خیالی" انھیں صوفیوں کے کام و زبان کا ممنون ہے۔ امام احمد حنبل۔ منصور حلاج نظام الدین اولیا اور ان کے خلفاء سرمد شہید وغیرہ کے ساتھ حکومتوں کا جو رویہ رہا وہ کسی پر پوشیدہ نہیں۔ محی الدین ابن عربی اور ان کے سب سے بڑے مؤید شیخ محب اللہ الہ آبادی کے بلند نظریات پر علمائے تنگ نظر کے تکفیری فتوے بھی ظاہر ہیں۔ اس قسم کے شواہد سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے۔

تصوف کی ایک حیثیت تعلیمی ادارہ کی بھی ہے۔ خانقاہیں روحانی "معمل" کا درجہ رکھتی تھیں جہاں "ذکر و شغل" ریاضت و مجاہدہ کے ذریعے سے مشاہدہ حاصل کیا جاتا تھا پھر وہ مشاہدہ بار بار

تجربہ کرنے کے بعد روایت و درایت کی کسوٹی پر کسا جاتا تھا تب کہیں عرفان یا اخلاق کی شکل میں عوام کے سامنے رکھا جاتا تھا۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے تصوف کی یہ حیثیت بھی افادیت سے خالی نہیں رہی۔ اس ادارہ نے توحید و رسالت پر ایقان و اطمینان پیدا کرنے کے لئے "سند اور حوالہ" کا کام دیا۔ جس طرح سائنس کے مسائل کے متعلق تمام شکوک و شبہات کا عملی حل یہ ہے کہ سائنس دانوں کی "سند اور حوالہ" پیش کر دیئے جائیں اور ان کی جماعت پر اعتماد رکھتے ہوئے ان کے مشاہدات اور تجربات کو صحیح مان لیا جائے اسی طرح الٰہیاتی اور ماورائیاتی حقائق پر تیقن حاصل کرنے کیلئے اہل تصوّف کی سند قابل اعتماد ہونی چاہیئے۔ یہی تقسیم عمل کا باہمی عماد ہے۔

شعر و شاعری کا تعلق تصوّف کی صرف نظریاتی حیثیت سے ہے۔ بلکہ صوفیا خیالات شعر کے سانچوں میں ڈھل کر ہستی و نیستی کا گہرا فلسفہ بن جاتے ہیں اردو کے بڑے بڑے شاعروں کی عظمت اس دریوزہ گری کے بل بوتے قائم ہو سکی جو انہوں نے اس بارگاہ عرفاں سے جائز رکھی۔ میر، غالب، اقبال، اصغر، کس نے اس میخانے کی تلچھٹ خرقۂ سجادہ کے عوض نہیں خریدی۔ مگر ہر شاعر کی فیض پذیری اور اس کی نوعیت جداگانہ ہے۔ فانی نے تصوف سے جو کچھ اخذ و استفادہ کیا اس کی حیثیت روایتی ہے لیکن اس کے روایتی

تصوف میں وہ متغزلانہ اور فن کارانہ "تصرف" پایا جاتا ہے جو دوسرے شعراء کو کم نصیب ہو سکا۔

فانی کا تصوف اسکے احساسات کی ایک تاویل ہے

طبیعت کی لطافت مذہبی رجحان اور زلیست کی محرومیوں نے مل جُل کر فکری لحاظ سے فانی کو ایک روحانی انسان بنا دیا تھا۔ شاید دل وہ آئینہ ہے جو صد پارہ ہونے کے بعد "حسن مطلق" کی بغیر مصوّر کائنات کی عکاسی کر سکتا ہے۔ اور انسان وہ غافل ذی حیات ہے جو بار بار ناکام ہونے کے بعد ہی اپنی پنہاں قوتوں کا احساس پیدا کر سکتا ہے۔ فانی کو بھی تلخ حیات کی تہوں میں کچھ لطیف معانی کا ادراک ہوا۔ اس نے اپنے خیالات اور معتقدات کی تسکین کے لئے کچھ صوفیانہ حقائق کا سہارا لیا۔ فلسفہ یا تصوف کا سہارا لینا شاعر کے لئے آسان کام نہیں۔ اس سہارے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے تخیلات و احساسات کی متصوفانہ یا فلسفیانہ تاویل پیش کی جائے وہ بھی اس انداز میں کہ "شعریت" کے اجزائے جمیل کا تناسب و توازن قائم رہے۔ فانی نے اس تاویل و تشریح میں احساسات کی نزاکت اور اندازِ شعریت دونوں لطیف عناصر باقی رکھے ہیں اس نے فلسفی شعراء کی طرح تسلسلی طریقہ نہیں اختیار کیا اور نہ تشبیہ و استعارہ کے رنگین حجابات ڈالے بلکہ بیشتر اس نے "اظہار جمیل اور تخلیق

"حسین" سے کام لیا ہے

مژدۂ جنت وصال ہے موت ؎ زندگی محشر جدائی ہے

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی

زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

اگرچہ یہ صحیح نہیں کہ فانی نے اپنے حسیات کی ایک صوفیانہ تاویل پیش کی ہے تو یہ صورت ہو سکتی ہے کہ وہ ایک مستقل زاویۂ نگاہ کا مالک ہے اور اسی نظریہ کی عینک سے حیات و کائنات کی باریک رگوں ریشوں پر نظر ڈالتا ہے جس کی وجہ سے احساسات کی دنیا اس کو ایک خاص رنگ میں رنگی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ اور بھی اہم کارنامہ ہوگا اپنے تخیلات اور مشاہدات میں خاص اپنے گوشۂ نگاہ کی عکاسی کرنا بھی بڑے صناع کا کام ہے اردو میں ایسے شاعر بہت کم ہیں جو اپنے فرمودات کی تہہ میں اپنا خاص نظریۂ حیات بھی رکھتے ہوں جوش کی عظمت اور نئے ادب کی وسعت بھی اس سے خالی ہے کلام فانی کا گہرا مطالعہ اس امر کی تائید کرتا ہے کہ وہ خاص اپنا نظریۂ حیات نہیں رکھتا بلکہ فلسفہ کے مختلف اسکولوں کے مختلف نظریات کے مطابق اپنے احساسات کی تاویل و تحلیل پر قدرت رکھتا ہے۔

عقیدۂ جبر

ہر زمانہ میں انسانی اعمال و افعال پر بحث ہوتی آئی ہے اور اختلاف آرا کے طویل مگر دلچسپ سلسلے نے بڑھتے بڑھتے مستقل فلسفوں کی شکل اختیار کرلی ہے۔

فلاسفۂ اسلام میں "اشعری" اور "معتزلہ" میں بڑا اختلاف ہے۔
اشعری "اکتساب عمل" کے قائل اور معتزلی "خلق عمل" کے۔
غیر اسلامی مفکرین میں ایک گروہ "جبر" کا قائل تو ایک "قدر" کا۔ درحقیقت
یہ بحثیں صرف نظری بلکہ صرف لفظی ہیں جہاں زندگی اور زندگی
کے ہنگامے ہیں وہاں شاید اپنی ہی قوت سے مجبور ہو جانے
کا نام اختیار ہے۔ فانی کہتا ہے ؎

اختیار اک ادا تھی مری مجبوری کی
لطف سعی عمل اس مطلب حاصل سے اُٹھا

حدیث میں تقدیر کی نظری بحثوں سے امتناع کا حکم اس
لئے آیا ہے کہ اُمّت وسطیٰ شکوک و شبہات میں مبتلا ہو کر عملی
جد و جہد سے قاصر نہ رہ جائے۔ مگر اس سے کسی کو انکار نہیں
ہو سکتا کہ زندگی میں کبھی کبھی جبر کا شدید احساس ہونے لگتا ہے۔
جہاں تک قدرت اور اختیار کے احساس کا تعلق ہے انسانوں
پر خود آگہی اور دستگاہِ ارادی کا ایک نشہ سا ہر وقت طاری رہتا
ہے۔ جس کے سرور و انبساط میں ہر متنفس رواں دواں نظر
آتا ہے۔ یہی فطرت بشری ہے۔

با اختیار زندگی کا یہ زندہ احساس "خود مجبوری" کے نظری
عقیدے کی ہر لمحہ اور ہر آن تکذیب کرتا رہتا ہے۔ مولوی ؒ ی
نے جہاں ایسے باریک مسائل حیات پر بحث کی ہے وہاں

"حسِ زندہ" پر استدلال کی بنیاد رکھی ہے نہ کہ "فکرِ مردہ" پر ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

وہ ہزاراں لقمہ یک خاشاک خرد
چوں در آمد حسِ زندہ پئے ببرد

سیکڑوں لقموں میں اگر ایک تنکا انسان کے منہ میں آجاتا ہے تو فوراً اس کا احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس اور وجدان بدیہی چیزیں ہیں ان کے لئے کسی دلیل کی احتیاج نہیں ع

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

جبر کے متعلق فرماتے ہیں ؎

گر ز جبرش آگہی زاریت کو
بینش زنجیرِ جباریت کو

اگر تم مجبور ہوتے تو اس کا احساس ہوتا اور احساس کے علامات ظاہر ہوتے۔ ایک اور شعر میں اسی کے متعلق لکھتے ہیں ؎

کافراں را کارِ دنیا اختیار　　انبیاء را کارِ عقبیٰ اختیار

یعنی جس طرف لوگوں کا رجحان ہوتا ہے اس میں خود کو مختار سمجھتے ہیں۔ مگر جدھر ان کی طبائع کا میلان نہیں ہوتا اس میں مجبوری کی آڑ لیتے ہیں۔ گویا نفس کی شرانگیزی ہمارے دماغ کو کثیر حقائق کے ادراک سے محروم کر دیتی ہے۔ یہ نفس ایک دوزخ ہے جو تمام بہشتی احساسات سے ہمیں بیگانہ کر دیتا ہے۔ رومی کا قول ہے ؎

دوزخ است ایں نفس و دوزخ اژدہاست
کو بدریا ہانہ گردد کم و کاست

ایک شاعر نفس مزکّی لیکر پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس کی نفسی حالت میں احساس و جذبات کی خفت اور شدت سے بہت بڑا تغیر رونما ہو جاتا ہے۔ پھر قوت متخیلہ کی سحر کاریاں اس میں شامل ہو کر پربت کو رائی یا رائی کو پربت بنا دیتی ہیں۔ لیکن اس کھینچا تانی میں حقیقت تبدیل نہیں ہوتی صرف اس کا کوئی پہلو پنہاں یا نمایاں ہو سکتا ہے شاعر کا کمال یہی ہے کہ جس پہلو کو اچھالے اسے ایک زندہ، موثر اور عالمگیر حقیقت بنا کر کھڑا کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بڑا شاعر اکثر انتہا پسند ہوا کرتا ہے۔ فانیؔ کی عظمت بھی اسی قسم کی ہے اس کے غم اور مجبوری کے چند آنسو حیات و کائنات کی وسعتوں کو بہا لے گئے۔ اس کی ناکامی کے سراب میں زندگی کا اتھاہ سمندر جذب ہو کر رہ گیا اس کی تشنہ آرزوں کے بیابانوں میں دنیائے روشن ایک گوشۂ تاریک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ؎

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا
ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا

فانیؔ کے یہاں مجبوری میں ہی اصلی آزادی کا راز پنہاں ہے ؎

اسیر بند دل ہو کر غم دنیا سے فارغ ہوں
مری آزادیوں کا راز ہے مجبور ہو جانا

سیاسی مصنفین نے بھی سیاسی آزادی کی کچھ ایسی ہی تعریف کی ہے جس کا ماحصل کچھ پابندیاں اپنے اوپر عاید کر لینا ہے۔ اردو کے قدیم شعرا نے بھی مجبوری کے متعلق مضامین باندھے ہیں مگر ایسے اشعار خال خال ملتے ہیں۔ فانی کی طرح مستقل زاویۂ نگاہ کا اُن کے یہاں پتہ نہیں۔ ذوق نے اتنا کہہ کر ایک دوشی حاصل کی ہے۔ ع

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

فانی اسی مضمون کو باندھتا ہے ؎

دُنیا میں حال آمد و رفت بشر نہ پوچھ
بے اختیار آ کے رہا بے خبر گیا

"بے خبر گیا" کا اضافہ سچی واقعہ نگاری ہے۔

میر کے یہاں البتہ عقیدہ جبر زیادہ واضح طور پر ملتا ہے۔ مگر اس میں تخلیقی رنگ نہیں جیسا کہ ہمیں فانی کے یہاں ملتا ہے ؎

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے ہیں اختیار کے ڈھالا ہوئے تو ہیں

میر نے ایک جگہ اختیار کو انسان پر ایک تہمت اور الزام قرار دیا ہے ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

فانی بھی میر کا ہم خیال ہے مگر اس نے محشر میں دوست سے

دادطلبی کا ایک دلکش پہلو نکالا ہے ؎

محشر میں جبرِ دوست سے طالب ہوں داد کا

آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

غالب نے بھی انسانی زندگی کی بے ثباتی کو "کاغذی پیرہن" کہتے ہوئے "جبرِ دوست" کا اعتراف کیا ہے کہ انسان ایک نقشِ بیجاں کی طرح خانۂ نقاش کے آگے مجبور ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

غالب کے اس شعر میں پیکر تصویر کی سی خاموش فریاد ہے اور شکایت مگر فانی اس خلعتِ مختاری کا شکریہ ادا کر رہا ہے ؎

مجبوری عریاں کو یہ خلعتِ مختاری

اللہ رے کرم ہم اور توفیق گنہگاری

فانی کے نزدیک "جبر" شاید جبر کرنے والے کا سب سے بڑا آرٹ ہے۔ جس کے وجود کو کوئی شخص آسانی سے محسوس نہیں کر سکتا دوسرے شعرا کی طرح اس کے یہاں "مجبوری" کوئی بھدی اور نمایاں شے نہیں ؎

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں

ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

ایک اور شعر جس میں فانی خالق جسم و جاں سے سوال کرتا ہے

کہ اب ہمارے اعمال کی کیا حیثیت ہوگی نہایت لطیف ہے ؎

جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح
خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

اس میں کوئی شک نہیں کہ جبر کے متعلق فانی کے اشعار اردو شاعری میں بے نظیر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جبر و اختیار کے الفاظ تو چند ہی شعروں میں ملیں گے مگر جسے احساس مجبوری کہتے ہیں وہ فانی کے پورے کلام میں منتشر پایا جاتا ہے۔ فانی اس شکست و مجبوری کی تبلیغ میں کسی اضطراری کیفیت کا پابند نہیں وہ عمداً اس تذکرہ سے سکون و سرور حاصل کرتا ہے۔ وہ اس راہ کا سالک ہے نہ کہ مجذوب

یہ سالک و مجذوب ہم کو شاعری کے میدان میں بھی دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ حکیمانہ شاعری کی دنیا میں اقبال سالک تو نطشے مجذوب۔ اقبال خود کہتا ہے ؎

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

قدیم فارسی شاعری میں خاقانی شیروانی مجذوب سخن گذرا ہے۔ موجودہ اردو شاعری بھی اس قسم کے مجذوبوں سے خالی نہیں۔ یگانہ چنگیزی اسی سلسلے کے مرید ہیں۔ فانی بھی کبھی کبھی مجذوبانہ انداز میں بات کرنے لگتا ہے۔ مگر اس کے جذب سے اس کا

سلوک پھوٹ پڑتا ہے وہ "دیوانہ بکار خویش ہشیار" ہے ؎

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

فانی سمجھتا بھی ہے اور سمجھاتا بھی مگر دیوانے کا خواب کہہ کر یورپ کے بڑے بڑے فلسفی شاعر جیسے شوپنہار اور ہارڈی جبر کے حامی ہیں۔ ایشیائی فلسفیوں میں خیام اور صوفیوں میں حافظ شیراز جبر کے اشارات رکھتے ہیں۔ فانی نے ان کے میخانوں سے تھوڑی سی شراب مانگی ہے۔ اور صناعی حاضر کے نازک اور خوشنما ساغر میں ڈھال کر مجلس غم میں رکھدی ہے ؎

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھلے ہوئے تو ہیں

فانی قدرت کو شوپنہار کی طرح اندھے کی لاٹھی نہیں خیال کرتا بلکہ اس کے یہاں قدرت ایک "نظام جبر" ہے جو مرتب و مسلسل باقی اور جاودانی طور پر بڑی دانشمندی کے ساتھ قائم کیا گیا ہے ؎

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قید حیات
مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

فانی نے حافظ و خیام کی طرح لذت و مسرت پر "جبر" کی حجاب آرائی نہیں کی اور نہ نظام عالم کے تار و پود و بکھیرنے کی ناکام کوشش کی بلکہ وہ اس "نظام جبر" کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔

ناکامیوں اور محرومیوں میں زندہ رہنے کے سلیقے سکھاتا ہے۔ طبائع کو مایوسی، احساس کو تلخی زندگی کو سخت جانی، موت کو حسن جمال بخشتا ہے۔ اس کے یہاں فرار کی جگہ مقابلہ اور شکست بلکہ اصرار شکست کا انداز پایا جاتا ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جن کی تازہ تخمیر و ترکیب پر آج ترقی پسندی کو بہت کچھ فخر ہے ؎

جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح

خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

"تسلیم جبر" ہے نہ کہ "تسلیم و رضا" جس میں انسان قدرت و اختیار رکھتے ہوئے خوشنودی محبوب کے لئے کوئی چیز تسلیم کرتا ہے جبر کے متعلق جو کچھ فانی نے لکھا وہ اس کا ذاتی عقیدہ ہو سکتا ہے یا چند فلسفیوں اور شاعروں کی تقلید۔ مگر جہاں تک اس کا تصوف کی روایات سے تعلق ہے جمہور صوفیا اس عقیدے کے خلاف ہیں۔ عبد القادر جیلانی تو بعض ارشادات کی بنا پر قدرت و اختیار کامل کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا روم بھی انسانی قدرت و اختیار کے موید ہیں ؎

اولیا را ہست قدرت از الٰہ ! تیر جستہ باز گردانند زراہ

حکیم سنائی بھی قدرت و عمل کا قائل ہے کہتا ہے ؎

یا برو ہم چوں زناں رنگ بوئے پیش گیر

یا بیا ہم چوں مرداں گوئے در میداں فگن

ان کے علاوہ ابن عربی شہاب الدین سہروردی۔ مجدد الف ثانی وغیرہ اس غیر اسلامی عقیدے کے خلاف ہیں

فانی کا نظریۂ فنا ۔ ایک ناکام آرزو افسردہ دل شاعر کے لئے موت کا خیر مقدم کرنا بالکل فطری چیز ہوگی یا قدیم روایتی طور پر موت کا تذکرہ کرنا کسی کی رعنائیوں پر مرنا اور جینا بھی شعریت کا ایک معصوم انداز خیال کیا جائے گا۔ جیسا کہ پرانے اردو شعرا کے عاشقانہ دواوین سے ظاہر ہے۔

مگر دورِ جدید کا یہ مفکر شاعر موت اور فنا کا نام صرف روایتی انداز میں لیکر خاموش نہیں رہ سکتا۔ اس نے فنا اور موت پہ فلسفیانہ نگاہ ڈالی۔ زندگی کے نئے اور پرانے حجابات اٹھائے اور اس رقص گہہ آفات میں موت کو عریاں رقص کناں دیکھ لیا۔ وہ خالص "تصورِ مرگ" کا قائل ہے جس میں حیات کا جزو شامل نہیں ہے

موت ہستی پہ وہ تہمت تھی کہ آساں بھی
زندگی مجھ پہ وہ الزام کہ مشکل سے اٹھا

اس کی تجلی کائنات میں بھی اثبات وجود کا پہلو نہیں ہے

کیفیت ظہور فنا کے سوا نہیں
ہستی کی اصطلاح میں دنیا کہیں جسے

اردو اور فارسی کے صوفی شعراء کائنات کے وجود کے معترف ہیں مگر اس کی بے ثباتی پر زور دیتے ہیں شیخ سعدی شیرازی جیسا

حکیم ملت بھی اس اثر سے نہیں بچ سکا۔ دراصل یہ حربہ حرص جاہ و دولت کے خلاف استعمال کیا گیا تھا جسے رفتہ رفتہ تقلیدی متصوفین نے درویشی کے اصول میں سے سمجھ لیا۔ ربّنا ما خلقت ھٰذا باطلا کی روشنی بھی ان کی رہنمائی نہ کر سکی۔ ہندوستان میں سب سے پہلے خانوادۂ چشت نے اس بدعت کو بیخ دین سے اکھیڑنے کی کوشش کی اور اس عالم بے ثبات کو "اعیان ثابتہ" کا رتبہ دے کر دنیا کے معرفت میں نئی راہیں کھول دیں۔ بلاد اسلامیہ میں ابن عربی اور مولوی رومی کی تصانیف نے خیالات میں انقلاب پیدا کیا۔ پھر بھی ہر زمانے میں کچھ فلسفی اور کچھ شاعر اس جیتی جاگتی دنیا کو طلسم خیال اور صورت وہم و گمان کہتے آئے۔ ہمارے اردو کے قدیم شعراء بھی رسمی اور روایتی طور پر اس افسانے کو دہراتے رہے غالب نے کہا ہے ؎

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ؛ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

میر انیس کہتا ہے ؎

غفلت کو عاقل حباب سمجھے ہیں
وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں

فارسی شعراء میں حافظ شیرازی اس مسلک کے ہادی اور اس دین کے پیغمبر ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

حاصل کارگہ کون و مکاں ایں ہمہ نیست
بادہ پیش آر کہ اسباب جہاں ایں ہمہ نیست

اعتبارے نیست بر دورِ جہاں ، بلکہ بر گردوں گرداں نیز ہم

غزل کی غزل دورِ جہاں کی بے ثباتی بے اعتباری اضمحلال اور ضعف کی تبلیغ میں ہے۔ بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں ہستی کو وہم و گمان سے زیادہ حیثیت نہیں دی گئی ہے۔ درحقیقت یہ عدم پرستی اور فنائے محض کا قائل ہونا ہے۔ فانی کی نگاہ میں بھی دُنیا "عالم اعتبار" ہے ؂

عالم جز اعتبار نہاں و عیاں نہ تھا
یعنی کہ تو عیاں نہ ہوا اور نہاں نہ تھا

زندگی کو خواب تو بہتوں نے کہا ہے مگر موت کو تعبیر کا اور تعبیر کو منتہائے عرفان انسانی کا درجہ دینا فانی کے خاص فلسفۂ موت کا تقاضہ ہے جو صرف انجام اور وہ بھی مادی انجام تک انسانی ذہن کی رہنمائی کرتا ہے ؂

تعبیر اجل نے دی اس خواب پریشاں کی
ہم مر کے تجھے سمجھے اے ہستیِ انسانی

فانی موت کو نجات خیال کرتا ہے۔ حالانکہ اصل نجات زندگی اور سماج کے صحیح راستے پر گامزن ہو جانے میں ہے جس کا نام قرآنی زبان میں "فلاح" ہے۔ وہ موت کا اس تپاک کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہے۔ جس تپاک سے کوتم بدھ "نروان" کا ؂

دشنۂ غم کو مبارک تندیٔ خونِ آرزو
زیست کو مژدہ کہ مرجانے کا ساماں ہوگیا

اس کی زندگی کا مقصد صرف موت ہے۔

بالیں پہ ہم جب آ گئے تو آئی وہ موت بھی
جس موت کے لئے ہمیں جینا ضرور تھا

وہ زندگی سے پیار نہیں رکھتا نہ عالم سے محبت۔ یہی نہیں اس کے یہاں حیات و کائنات سے ایک طرح کی بیزاری پائی جاتی ہے۔ جو اثنا عشری فلسفۂ مذہب کے سوا کہیں بھی اثباتی وجود نہیں رکھتی ہے۔

زندگی سے ہو بیزار فانی اس سے کیا حال
موت کو منا لوگے جان سے خفا ہو کر

ہو غم ہستی جاوید گوارا یوں کر
جان کیا دیں کہ بہت جان سے بیزار ہیں ہم

فانی کی نظر میں فنا ایک ایسی چیز ہے جو اشکال آب و گل کو قبول کر سکتی ہے اور چھوڑ سکتی ہے اس حیثیت سے یہ عالم خاک فنا کا ظہور ہے نہ کہ بقا کا۔

کیفیت ظہور فنا کے سوا نہیں
ہستی کی اصطلاح میں دنیا کہیں جسے

شعر بالا سے ظاہر ہے کہ کائناتی طور پر بھی فنا کا تصور اس کے یہاں مادی ہے۔ دنیا اس کے خیال میں ایک نقش بے قرار ہے

جس کا وجود ذہن میں ہے ؎

فانی سکون موت نے دل سے ہٹا دیا
وہ نقش بے قرار کہ دنیا کہیں جسے

حیاتِ دل کا انحصار اس کے نزدیک صرف موت پر ہے ؎

ہے موت ہی اک زندگیِ دل کا سہارا
جینے کی جو ایسی ہی تمنا ہے تو مر جا

"فنا" ایک روحانی تصور ہے اور موت دنیائے مادی کا ایک واقعہ۔ دونوں لفظوں کا استعمال جداگانہ مواقع کا محتاج ہے۔ "فنا" دل کی زندگی پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ لیکن "موت" کو دل کی حیات و ممات میں کوئی دخل نہیں۔ اس پہلو سے اگر فانی کے سطورِ بالا شعر کو دیکھا جائے تو تخیلِ شعری کا صحیح اترنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ لامحالہ اسے فانی کے زاویۂ نگاہ سے دیکھنا اور سمجھنا ہے۔ اس کے نزدیک "موت" اور "فنا" الگ الگ چیزیں نہیں۔ اس کی فنا جسمانی اور مادی فنا ہے۔ جو موت کی مترادف ہے۔ باوجود اس کے وہ تمام کمالات جو "فنا" کے تصور کے لئے مستلزم ہیں اس نے موت کے خاکی دامن سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ موت کے فلسفہ کا یہی پھیلاؤ "فنا کا مادی تصور" قائم کرتا ہے۔ جس کو تصوف اور اربابِ تصوف سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ فنا کا مغربی تصور ہے۔ جسے فانی نے اردو شاعری

بیں روشناس کیا ہے۔ وہ ایک موقع پر فنا کے متعلق کہتا ہے ؎

لذت فنا ہرگز گفتنی نہیں یعنی

دل ٹھہر گیا فانی موت کی دعا کر کے

شعر صاف ہے اور اس سے فانی کے نظریہ فنا کا تعین اور وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ تصور ایشیائی اور اسلامی نظریہ فنا کے بالکل برعکس ہے۔ ایشیائی نقطۂ نگاہ سے ہر انقلاب خود گذاری یا محویت کا تعلق "فنا" سے ہے۔ اور فنا کی یہ منزلیں موت سے پہلے پہلے طے ہو جاتی ہیں۔ پھر ہر "فنا" کے بعد ایک "بقا" ہے۔ انسان اپنی مختصر سی زندگی میں فنا اور بقا کے کتنے مراحل سے گذر کر اپنی اصلی "بقا" حاصل کرتا ہے۔ "مرنے سے پہلے مرجاؤ" کا بھی یہی پیغام ہے کہ انسان عظیم انقلابات اخلاقی و روحانی سے گزر کر "خلق عظیم" اور "مقام محمود" کی معراج تک پہنچنے کی کوشش کرے ؎

ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

فلسفۂ موت سے قطع نظر کر کے جہاں اس نے زندگی کو بڑی سے بڑی قیمت دی ہے وہاں اس نے صرف اتنا کہا ہے ؎

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

عالم اس کی نظر میں اگر اعتبار محض ہے یا زندگی دیوانے کا

خواب، اس سے اس کی روحانی پرواز میں کوئی نقص واقع نہیں ہو سکتا تھا۔ جس چیز نے فانی کی ماورائی ترقی بالکل محدود کردی اور اس کی صلاحیتوں کو ایک زندان خیال میں محبوس کردیا وہ "فنا کا مادی تصور" ہے۔ اس کی مایوسی، غم، مجبوری، شکست کے عناصر کے لئے محور یہی فنا ہے جو موت کی مترادف ہے۔

اس کے دماغ کی معراج اور دل کی آخری آرزو بھی یہی ہے ؎

موت وہ دن بھی دکھلائے مجھے جس دن فانی
زندگی اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہو جائے

ہمہ اوست یونان قدیم اور ویدانت کے ہندوستان میں اس مسئلہ کی بنیادیں صاف طور پر ملتی ہیں۔ قرآن اور حدیث سے صرف "اضمحلال وجود" ثابت ہوتا ہے مگر صوفیائے کرام کی بہت بڑی تعداد اس حقیقت کی قائل ہے۔ منصور کی "انا" کی پرورش اسی گہوارۂ "اوست" میں ہوئی۔ یہاں تک کہ ہر وہ صوفی جو "ہمہ اوست" کا قائل ہے ایک بار "انا الحق" کی خرابات سے ضرور گزرتا ہے اور بقدر ظرف ایک قطرہ سے ایک دریا تک پینے کی جسارت کرتا ہے۔ منصور نے بھی اس خم خانہ "انا" سے ایک قطرہ لیا، جس کا انجام، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی زبان سے سنیئے۔ "منصور بچہ بود در یک قطرہ بفریاد آمد ایں جا مرداں اند کہ دریاہا فرو برند و آروغ نمی آرند۔"

ابن عربی نے فصوص الحکم لکھ کر ہمہ اوست کی حکیمانہ طور پر
تبلیغ و اشاعت کی اور علم و عرفان کی نہریں اس "سبزۂ بیگانہ" کی بیخ
و بُن تک پہنچا دیں۔ ہندوستان کی سرزمین اور آب و ہوا اس
خود رو پودے کو ایسی راس آئی کہ کچھ ہی دنوں میں ایک تناور درخت
ہوگیا۔ اور خانوادۂ چشت کی آبیاری سے اس کی جڑیں زمین پر
اور شاخیں آسمانوں پر پھیل گئیں۔

ایسا عظیم الشان شجر جس کو مجدد الف ثانی کے خار اشگاف تیشے
(ان کا قول "توحید کوچہ تنگ است" ہمہ اوست سے اختلاف کے سلسلے
میں ہے) بھی نہ کاٹ سکے آخر تھک کر انھوں نے کلہاڑی رکھ دی اور
کہا "از مقبولاں بہ نظر آید انکار دخطر دارد" یہ الفاظ مجدد الف ثانی
کے ہیں جس میں انھوں نے ابن عربی کی فصوص الحکم اور اس کی عرفانی
عظمت کا مودب اعتراف کیا ہے۔

فارسی شعراء نے اس مسئلہ سے کافی دلچسپی لی ہے کیونکہ بقول علامہ
شبلی یہ مسئلہ بجائے خود شعر ہے۔ ایک کا بیک وقت ہزار اور پھر ایک
ہونا کس قدر حیرت انگیز ہے۔ مظاہر کائنات میں وہی ظاہر ہے۔ مگر
کسی مظہر میں یا بہت سے مظاہر میں اس کے ظہور کی تعیین نہیں
کی جاسکتی ہے

مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عین اوست
اما نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

مولانا روم نے اس نکتہ کی وضاحت میں بڑی احتیاط اور دور اندیشی سے کام لیا ہے فرماتے ہیں۔

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں ؛ گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

وہ "حدیثِ دیگراں" کے رباب اور نالۂ نے کے پردوں میں یہ نغمے بجاتے ہیں ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند ؛ وز جدائیہا شکایت می کند

زیادہ سے زیادہ وہ اتنا کھل سکے ہیں۔

جملہ معشوق است و عاشق پردہ
زندہ معشوق است و عاشق مردہ

قدیم اردو شاعروں میں میر، درد غالب نے اہتمام کے ساتھ ہمہ اوست کے متعلق مضامین باندھے ہیں خواجہ درد کا شعر ہے ؎

مٹ جائیں اک آن میں کثرت نمائیاں
ہم آئینے کے سامنے گر جا کے "ہو" کریں

غالب کا خیال ہے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

میر کا مشاہدہ ہے ؎

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

آسی سکندر پوری (سلسلۂ ناسخ کے بہترین شاعر) کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

وصل ہے پر دل میں اب تک ذوقِ غم پیچیدہ ہے
بلبلہ ہے عینِ دریا میں مگر نم دیدہ ہے

اس میں ایک شعر ہے مگر پرانے انداز میں ؎

بے حجابی یہ کہ ہر شے میں ہے جلوہ آشکار
اس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

صوفیانہ شاعری میں خواجہ میر درد کے بعد آسی سکندر پوری کا ہی نام لیا جا سکتا ہے جو ایک مستقل صوفیانہ لَے کے مالک ہیں۔ آسی کی زمین میں فانی کے بھی شعر ملاحظہ ہوں ؎

شکوہ کیا کیجئے نگاہِ یار خود غم دیدہ ہے
کیا تماشہ ہے کہ دل کا چور بھی دزدیدہ ہے

دوسرے شعر میں فانی نے فیض پذیری کے ساتھ ساتھ مضمون آفرینی کا بھی ثبوت دیا ہے اور "وحدت وجود" کی عمدہ طرز میں تلقین کی ہے ؎

اس کی ہستی سے جدا میرا وجود اللہ رے وہم
بلبلہ ہے عینِ دریا پھر بھی دامن چیدہ ہے

فانی کے کلام میں ہمہ اوست کے تابدار ذرات شعریت اور تغزل کی نوک پلک کے ساتھ جگمگاتے نظر آتے ہیں ؎

پھر تو مضراب جنوں سازِ انا لیلیٰ چھیڑ
ہائے وہ شورِ انا القیس کہ محمل سے اٹھا

محمل لیلیٰ کا ایک اور جلوہ ؎

اے عزم خبر ہوش کے پردوں کو الٹ دے
اے ذوق نظر محمل لیلیٰ سے گذر جا

کبھی حجابات ظلمانی اٹھ جانے کے بعد اس کی تجلیاں بے نقاب ہو جاتی ہیں ؎

تعینات کی حد سے گذر رہی ہے نگاہ
بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

کبھی حجابات نورانی حائل ہو جاتے ہیں اور پردۂ نگاہ بھی اٹھا دینا ہوتا ہے ؎

میری نظر کی آڑ میں اُنکا ظہور تھا ؛ اللہ ان کے نور کا پردہ بھی نور تھا

فانیؔ ہمہ اوست کے سلسلے میں اثبات حق سے زیادہ نفی وجود کے پہلو پر زور دیتا ہے جو اس کا پسندیدہ طرز نگاہ ہے ؎

مرا وجود ہے میری نگاہِ خود شناس
وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو رازداں ہوتا

یہ عالم بھی اس کی رعنائیوں کا ایک عالم ہے ؎

کچھ نہ وحدت ہے نہ کثرت نہ حقیقت نہ مجاز
یہ ترا عالم مستی وہ ترا عالم ہوش

حضرت نیاز فتحپوری کا حسن سماعت اصغر کے "وجود شہود" سے بہت چیں بجبیں ہے۔ مگر فانی کا "جبر و قدر" اس کی "وحدت اور حقیقت" اپنی ثقالت میں اس سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اگر ان ثقیل الفاظ سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو فانی کے اکثر اشعار میں "ہمہ اوست" سے زیادہ "ہمہ شعر" کے انداز پائے جاتے ہیں ؎

یہ کیا ہے پھر کہ مجھے اک جہاں نظر آیا
خمار بادۂ وحدت اگر نہیں ہے مجھے

یہ جستجو ہے کہ ہے عالم مجاز کہاں
تلاش چشم حقیقت نگر نہیں ہے مجھے

اشعار بالا اگر تصوف میں ہیں تو پھر شعر کسے کہتے ہیں؟ غالباً تصوف اور شعریت میں کوئی تناقص نہ ہونا چاہیئے یہ شاعر کا کمال ہے کہ وہ خشک سے خشک مسائل کو شعر کے پیمانے میں ڈھال کر آتش سیال بنا دے۔ اس وصف میں فانی بڑی ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کے ان صوفیانہ شعروں میں اس کے دل کی لرزش بھی شامل ہے اور کبھی کبھی اس کے "خشک تار" سے "آواز دوست" آنے لگتی ہے ؎

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست
از کجا می آید ایں آواز دوست

معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد قدیم فلاسفہ میں ایک فرقہ "لاادریہ" گذرا ہے جس کا خیال تھا کہ انسان زیادہ سے زیادہ اپنی لاعلمی کے متعلق بیان سکتا ہے۔ بعضوں نے خواجہ حافظ کو بھی اسی خیال کا حامی قرار دیا ہے۔ حالانکہ حافظ علم حقایق کا قائل ہے۔ مگر اس کے نزدیک حقائق الاشیا کا یہ علم "مطرب و مے" کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے "حکمت" اس معمے کو حل نہیں کر سکتی ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نہ کشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

اب فانی سے علم بشر کا حاصل سنیئے ؎

حاصل علم بشر جہل کا عرفاں ہونا
عمر بھر عقل سے سیکھا کیئے ناداں ہونا

عقل سے نادانی سیکھنا ایک شاعرانہ انداز بیاں ہے۔

"اَلرِّضَاءُ بِالْقَضَاءِ بَابُ اللّٰہِ الْاَعْظَم" —— تسلیم و رضا قرب یزدانی کا کھلا ہوا راستہ اور ہمت کا سب سے بڑا امتحان ہے اس مقام کا تصور فانی کے لئے جانفزا ہے ؎

اے شوق طلب بڑھ کر مجنونِ ادا ہو جا
اے ہمت مردانہ راضی برضا ہو جا

فانی اس گرمجوشی کے ساتھ "رضا" کا استقبال کرتا ہے جس جا بکدستی

کے ساتھ اقبال اس تصور کا استیصال کرنا چاہتا ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال کی خودی کی رفعت کے بعد فانی کی خودسپاری ملاحظہ ہو ؎

بیگانۂ اختیار ہو جا   راضی برضائے یار ہو جا

فانی اور اقبال کی "رضا" میں کوئی تضاد نہیں فرق صرف اتنا ہے کہ فانی کی "رضا" مقام فنا سے تعلق رکھتی ہے اور اقبال کی "رضا" مقام بقا سے جو بعد کی منزل ہے۔ فانی جس سپردگی اور خودگزاری کی دعوت دے رہا ہے اس پر لبیک کہنا ہر مدعی کا کام نہیں۔ بقول فیضی قدرت کے ان طمانچوں کے لئے "روئے کشادہ" درکار ہے ؎

روئے کشادہ باید و پیشانی فراخ
آنجا کہ لطمہ ہائے یداللہ می زنند

المجاز قنطرۃ الحقیقت ـــ عشق ظاہری عشق باطنی کا وسیلہ ہے فانی نے بھی محبت کے یہ زینے طے کئے ہیں ؎

ماسوا کی راہ سے جانا پڑا ہے سوئے دوست
کفر بھی دل کی بدولت جزو ایماں ہو گیا

اگر فانی کو "ماسوا کی راہ" سے جانا پڑا ہے تو غالب کو بھی اس منزل میں بارہا رقیب کے گھر سے ہو کر گذرنا پڑا ہے ع

جانا پڑا رقیب کے گھر پر ہزار بار

فانی کو بھی اس مرحلے سے واسطہ پڑا مگر وہ کمند گیسو کے سہارے اوج
حقیقت پہ پہنچ گیا ؎

صید دل را بہر آگاہی ز صیاد ازل
در کمند طرۂ عنبر فشاں انداختہ

ذات بحت ۔۔۔ ذات بحت کا مکمل ادراک یا مشاہدہ آج تک کسی
کو حاصل نہ ہو سکا ۔ اس کی تلاش اور جستجو کا حاصل صرف "حیرت"
ہے ۔ فانی اپنے شاعرانہ انداز میں کہہ گیا ہے ؎

تری تلاش کا فی الجملہ ماحصل یہ ہے
کہ تو یہاں نہیں ملتا وہاں نہیں ملتا

قدرت صرف "آیات" کا درجہ رکھتے ہیں مرتبہ صفات
میں صرف اس کی "فعالیت" کا ادراک ہوتا ہے مگر وہ خود آنکھوں
سے اوجھل ہوتا ہے "جلوہ و پردہ" کا یہ عالم ملاحظہ ہو ؎

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

بلانا اور چھپ جانا پس پردہ میزباں کا مہماں ہونا یہ وہ متغزلانہ بیان
جو خاص فانی کا حصہ ہے ۔ ذات حق کا علم اگر کسی کو ہوتا تو وہ ضرور
کسی کو اس راز سے آگاہ کرتا ؎

کسی نے تجھ کو نہ جانا مگر یہ کم جانا
یہ راز ہے کہ کوئی راز داں نہیں ملتا

فانی کے اس قسم کے شعروں میں "مقدر" زیادہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے "غالبیت" پر "مومنیت" مسلط ہو جاتی ہے اور اس کا تصوف "کوہ کندن کاہ بر آوردن" کا مصداق ہو جاتا ہے۔

نگاہ و بیاں کی لطیف تشبیہہ سے مجاز و حقیقت کا نازک فرق سمجھا جاتا ہے جو تغزل کی باریکی اور لطافت کی عمدہ مثال ہے ؎

مجاز اور حقیقت کچھ اور ہے یعنی
تری نگاہ سے ترا بیاں نہیں ملتا

اسی غزل کا مطلع ہے ؎

ہزار ڈھونڈیئے اس کا نشاں نہیں ملتا
جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا

مطلوب کا سراغ نہیں مل سکتا طالب کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا ہاں طلب ایک ایسی چیز ہے جو مل سکتی ہے مگر وہ بھی ایک انداز طلب ہو کر رہ جاتی ہے ؎

تم ہیں رہ تسلیم میں طالب بھی طلب بھی
سجدہ بھی در یار ہے سجدہ ہی جبیں ہے

راہ طلب میں کسی منزل پر ٹھہر جانا مرگ طریقت ہے رومی کہتا ہے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست
ہر چہ بروے می رسی ہرگز مایست

فانی نے بھی اس مرحلے میں گرمیٔ رفتار سے نقش پا جلا دیئے ہیں ؎

گرم رو ہوں نقش پا بنتے گئے جلتے گئے
مسلک اپنا امتیاز جادہ و منزل نہیں

حقیقت انسانی ـــــ "عہد الست" سے پہلے اور "خلد" کے بعد تک جس چیز کا سراغ ملتا ہے وہ انسانی حقیقت ہے جس کو تصوف کی اصطلاح میں "حقیقت محمدیہ" کہتے ہیں یہ ازلی اور ابدی چیز ہے۔ یا فلسفہ کی اصطلاح میں "سرمدی" چیز کہیے اس کے دوام و قیام کے بارے میں کسی منہ پھٹ صوفی نے کہا ہے ؎

آدم نبود و من بدم حوا نبود و من بدم
او خود نبود و من بدم ملحد دیرینہ ام

فانی گر ملحد نہیں تو عقل کی نگاہیں کافر ورے کہتا ہے ؎

ہو بھی چکے تھے دام محبت میں ہم اسیر
عالم ابھی بقید زمان و مکاں نہ تھا

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ ـــــ عرفان نفس سب سے پہلا اور مشکل قدم ہے۔ اس منزل کی دشواری کے متعلق میر نے بھی اشارہ کیا ہے ؎

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

میر کے نادر اسلوب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فانی نے بھی دل ناداں کے فسانے میں یہ رمز بیان کر دیا ہے ؎

راز دل سے نہیں واقف دلِ ناداں میرا
تیرے عرفاں سے بھی دشوار ہے عرفاں میرا

تزکیہ نفس — نفس انسانی کی بغی اور طغیان کا علاج اہل دل کے نزدیک صرف محبت ہے۔ فانی کے شعر میں یہ حقیقت کس قدر دلکش پیرایہ میں مذکور ہے ؎

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا

"مشتے نمونہ از خروارے" آپ نے دیکھا کہ فانی نے تمام اہم مسائل تصوف پر طبع آزمائی کی ہے اور اپنی فن کاری اور تخلیقی صلاحیتوں سے شاعری کی داد دی ہے۔ مگر اس کا تصوف نہ غذائے روح بن سکا نہ انکشاف دماغ، قدیم روایات نے جدید اسلوب شعری کا جامہ پہن لیا ہے۔ جو قدیم شعرائے اردو کے خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ اسکا تصوف درد کی واردات، غالب کی درایت، اقبال کی تنقید، اصغر کے وجدان سے خالی ہے۔ کاش اسے اصغر کی طرح کوئی "ساقی" مل گیا ہوتا جو "دُردِ تہہ جام" کے ایک جرعہ میں "فنائے مادی" کے گورستان سے نکال کر اسے خمخانۂ بقا کی راہ میں ڈال دیتا۔ شاید وہ اس طرح "آسودگیٔ مرگ" کے طلسم سے نجات پا سکتا

کیا راہ طلب مر کے بھی طے ہوتی ہے آسی
آسودگیٔ حریت یہاں ہے نہ وہاں ہے

آسی سکندرپوری

خطوطِ فانیؔ

حکیم مختار احمد

حیدرآباد (دکن) سے بھی
مکان ۲۰۴
مورخہ ۵ رفروری ۳۳ء

عزیزم مختار احمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد دعائے ترقی درجات معلوم ہو کہ تمہارا خط مورخہ ۲۶ جنوری ۳۳ء کل ۴ فروری ۳۳ء کو مہاراجہ بہادر کی ڈیوڑھی سے واقع احوال پر ملا معلوم نہیں اس قدر تاخیر کیوں ہوئی بہرحال خط مل گیا اور خط کے ساتھ گولیاں بھی۔ شکریہ در شکریہ۔ اس سے قبل ایک اور خط بھی تم نے جوش صاحب کے پتے بھیجا تھا ملا تھا۔

میں بدستور مہاراجہ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے یہاں ہوں۔ ہنوز کوئی سلسلہ ملازمت نہیں ہوا ہے امید تو ہے کہ ہو جائے۔ عزیزم عشرت علیخاں نے ایک برس سے زیادہ ہوا خط و کتابت بند کر دی ہے اسلئے مجھے اُنکے لڑکے کی ملازمت کا حال پہلی مرتبہ تمہارے خط سے معلوم ہوا۔ خدا مبارک کرے۔

تمہارے شمس الحکماء ہونیکی مبارکباد کیا دوں۔ آمدنی کے اعتبار سے نجم الحکماء بھی ہو جاؤ تو مبارکباد دونگا۔ زیادہ دُعا۔

محمد شوکت علی خاں فانیؔ

حیدرآباد - ملے پلی - مکان نمبر ۲۰۲

مورخہ ۲۵ اپریل سنہ ۱۹۳۳ء

عزیزم سلمہ ۔ درخواست مع خط و بعدہٗ ایک پوسٹ کارڈ
دونوں پہنچے ۔ مگر مجھے ایک خط پرسوں اور ایک کارڈ کل ملا ۔ وجہ یہ
ہوئی کہ میں حیدرآباد میں نہ تھا گلبرگہ شریف گیا تھا وہاں علیل ہو گیا
آٹھ روز گلبرگہ شریف میں قیام کرنا پڑا پرسوں دس بجے دن حیدرآباد
پہنچا تب آپ کا خط ملا ۔

آپ تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کے کسی خط کا جواب نہیں
دیا ممکن ہے کہ آپ تک نہ پہنچا ہو اور اس لئے آپ صحیح فرماتے
ہوں مگر یہ حقیقت نہیں ہے ۔ میں نے ضرور جواب دیا، ممکن ہے
کہ کسی ایک خط کا جواب نہ دیا ہو اور وہ شاید اس خط کا جو آپ نے
جناب جوش صاحب کے توسط سے بھیجا تھا اور اس کی وجہ صرف
یہ تھی کہ وہ خط مجھے اتنی دیر میں ملا کہ جواب دینا بیکار ہو چکا تھا

درخواست پیش کرنے میں مجھے ذرا تامل نہیں ہے ضرور پیش کرونگا
مگر یہ بتانا چاہتا ہوں اگر آپ یقین فرمانا مناسب سمجھیں کہ کام اس
طرح نہیں ہوا کرتا جو نظیریں آپ نے دی ہیں وہ ہر شخص کے حالات کے متعلق نہیں ہیں ۔

زیادہ دعا ۔ محمد شوکت علی خاں فانی

نوٹ ۔ چونکہ ابھی مہاراجہ کی خدمت میں حاضر ہونے سے بوجہ علالت معذور ہوں
اس لئے دو چار روز تک درخواست پیش نہ کر سکوں گا ۔ فانی ۔

حیدرآباد سیتے پلی - مکان ۲۰۳

مورخہ ۲۸؍ جون ۳۳ء

عزیزم طول عمرہٗ - بعد دُعا کے معلوم ہو کہ تمھارا پوسٹ کارڈ
پہنچا - حالات معلوم ہوئے - مجھے اندیشہ ہے کہ تم میرا مشورہ نہ
مانوگے - اس لیئے کہ تم یہاں کے حالات کا اندازہ نہیں کر سکتے
تاہم میرا فرض ہے کہ تمھارا قصد معلوم ہونے کے بعد فوراً تمھیں
متنبّہ کر دوں - اس لیئے بلا لحاظ اس کے کہ تم مانو یا نہ مانو،
تمھیں یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ حیدرآباد کا قصد بلا تامّل
کر دو - اس مشورہ کا سبب کبھی زبانی کہوں گا فی الحال
اس قدر کافی ہے - اگر تم نے اس مشورے پر عمل نہ کیا تو
نقصانِ مالی کے علاوہ سخت پریشانی ہوگی -

میرا تقرر ہنوز نہیں ہوا ہے - دیکھئے کب ہوتا ہے اور
کہاں - یا غالباً ہوتا بھی ہے یا نہیں - عزیزی عشرت علی خاں کا
حال معلوم کر کے سخت پریشانی ہے - افسوس کہ کچھ نہیں
کر سکتا -

خدا رحم کرے اور کیا کہوں - زیادہ دُعا

حیدر آباد۔ (دکن) ملّے پلّی۔ ۲۰۴ئ

مورخہ ۲۴ جنوری ۳۹ء

عزیزم مختار احمد سلمہ اللہ تعالےٰ۔ عبدالقادر صاحب کے ہاتھ جو تم نے خط بھیجا تھا پہنچا۔ میرے گھر میں اب ایسی کوئی شکایت نہیں ہے۔ تاہم تمھاری بھیجی ہوئی ادویہ اور نسخہ جات اور پرسش حال کا شکریہ۔ تم نے اپنے متعلق کچھ نہ لکھا کہ اب کیا کیفیت ہے، کام کیسا چلتا ہے۔ عام حالات کیا ہیں۔ تم لکھتے ہو کہ تمھیں یہاں نہ آنے کا افسوس ہے۔ افسوس کسی طرح صحیح نہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اچھا ہوا تم اس زحمت سے بچ گئے۔ مشکل ہے کہ تم اس کو باور کرو مگر یہ پھر بھی حقیقت ہی رہے گی

بہت عرصہ سے میں خود بدایوں آنے کا قصد کر رہا ہوں دیکھئے مشیت الٰہی کیا فیصلہ کرے۔ میری ملازمت اب تھوڑے ہی دن بعد ختم ہے۔ معلوم نہیں کہ یہاں سے واپسی پر کہاں جاؤں اور کیا کروں۔ بظاہر بدایوں میں تو کوئی صورت نظر نہیں آتی حالانکہ دل بھی چاہتا ہے کہ زندگی کے آخری لمحات وہاں گذر جائیں تو بہتر ہے۔ زیادہ دعا

شوکت علی خاں فانیؔ